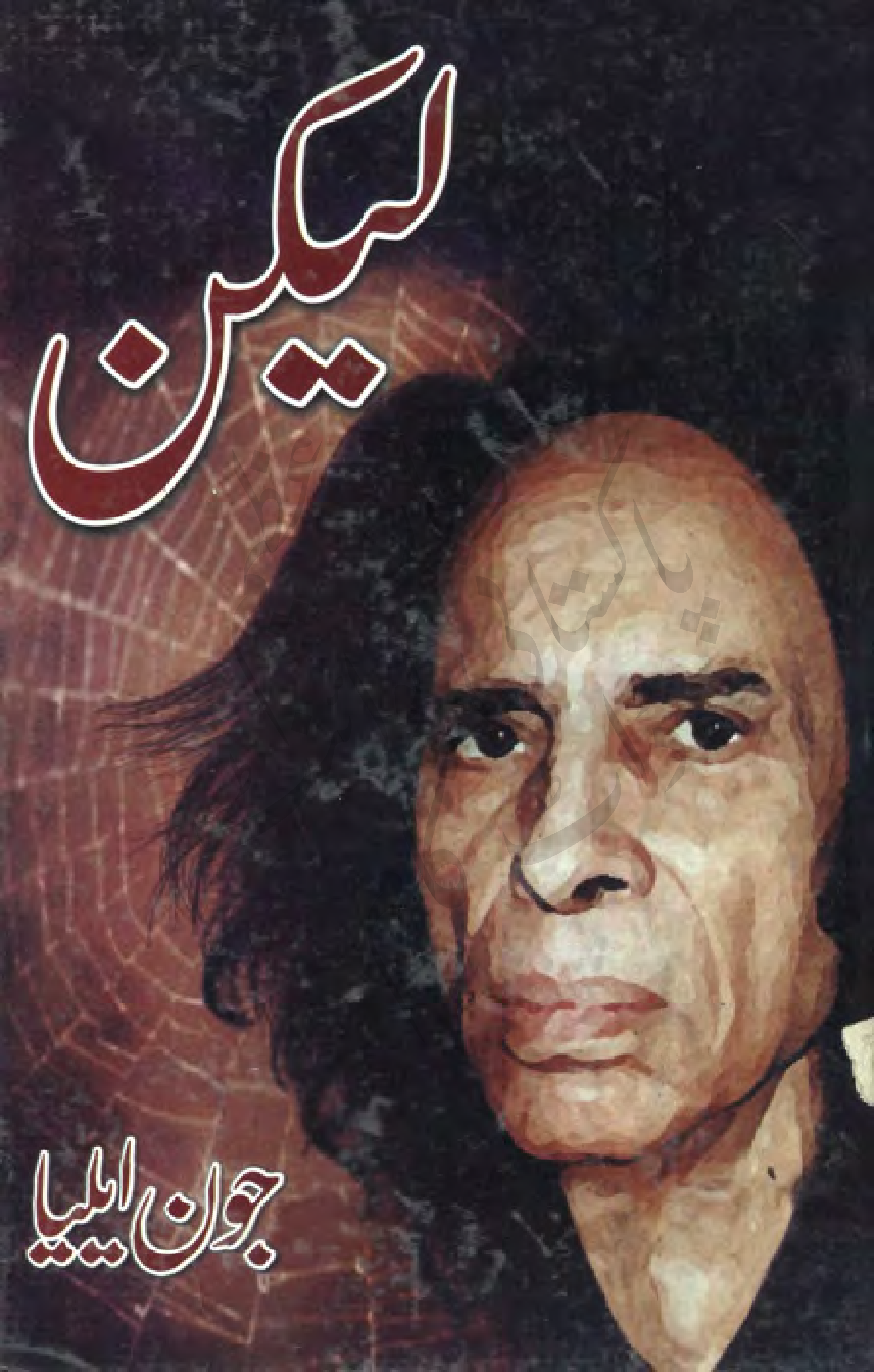

لیکن
جون ایلیا

نظمیں

اکادمی ادبیات پاکستان نے جونؔ ایلیا کے تیسرے مجموعہ کلام ''گمان'' کو ۲۰۰۴ء کا بہترین شعری مجموعہ قرار دیتے ہوئے علامہ اقبال ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اکادمی کے اس اعلان سے جہاں جونؔ ایلیا کے لاتعداد چاہنے والوں کو مسرت ہوئی' وہاں اس انتخاب نے مجھے بھی اعتماد بخشا اور تحریک دی کہ میں جونؔ ایلیا کا مزید کلام مرتب کر کے منظرِ عام پر لاؤں۔

میں یہاں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنے کی جسارت کر رہا ہوں' جیسا کہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جونؔ ایلیا ایک انتہائی زُودگو اور پُرگو شاعر تھے اور اُن کا کلام جابہ جا بکھرا ہوا ہے۔ میں اب تک وہ واحد شخص ہوں جو کہ شروع دن سے یہ کہتا رہا ہے کہ اُس کے پاس جونؔ ایلیا کا سپرد کردہ خاصہ کلام موجود ہے' جسے میں جونؔ ایلیا کے اہلِ خانہ کی اجازت اور تعاون سے مجموعوں کی صورت میں شائع کر رہا ہوں تا کہ اس سونپی ہوئی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکوں لیکن چند احباب جو کہ جونؔ ایلیا سے اپنے تعلقات و روابط کا ذکر اور محبت کا دم بھرتے نہیں تھکتے' اُن کے کلام کو مختلف ادبی رسائل میں شائع کروا کے نہ جانے جونؔ ایلیا کی کونسی خدمت کر رہے ہیں۔ میری اُن احباب سے گزارش ہے کہ اُن کے اِس اقدام سے جونؔ ایلیا کے آنے والے مجموعوں کی ادبی فضا متاثر ہو رہی ہے' اگر مقصد کلام شائع کروانا ہی ہے تو اُن کے آنے والے مجموعوں میں شائع کرائیں۔ میں یہ یقین دِلاتا ہوں کہ اُس فراہم کردہ کلام کو میں اُن حضرات کے نام اور شکریہ کے ساتھ شائع کروں گا' اِس طرح جونؔ ایلیا کا کلام مزید بکھرنے سے بچ جائے گا۔

جونؔ ایلیا اور اُن کے بھتیجے علامہ علی کرار نقوی صاحب کی محبت کا رشتہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اپنے بے شمار چاہنے والوں کے ہوتے ہوئے جونؔ ایلیا نے اُن کے گھر قیام کو ترجیح

دی، اُس کی وجہ بھی عیاں تھی، علامہ علی کرار نقوی صاحب اُن کا جس طرح خیال رکھتے تھے اور اُن کے انتہائی مشکل مزاج کو سمجھتے تھے یہ کسی اور شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُن کا جونؔ ایلیا سے محبت اور علم دوستی کا رشتہ ہنوز قائم و دائم ہے۔ انہوں نے اُن کے کلام کا کافی حصہ اپنے پاس محفوظ رکھا ہوا ہے اور اُن کی خواہش ہے کہ اگلے آنے والے مجموعہ میں اُس کو بھی مرتب کر لیا جائے۔ یہ اُن کی جونؔ ایلیا سے محبت کا دیرینہ ثبوت ہے۔ کاش، دوسرے احباب بھی علامہ علی کرار نقوی صاحب کے اِس قابلِ تحسین اقدام کی پیروی کریں۔

میری کوشش ہے کہ جونؔ ایلیا کے کلام کی کوئی بھی چیز جو کہ اشاعت کے قابل ہو، اُن کے مجموعوں میں شائع ہو کر محفوظ ہو جائے۔ اس سلسلے میں مجھے جو تگ و دو کرنا پڑی اور مختلف کتب خانوں کی خاک چھاننا پڑی، میں اُس کی تفصیل غیر مناسب سمجھتا ہوں، لیکن، نسیم احمد، محمد نعمان (غالبؔ لائبریری)، محمد زبیر، امان اللہ (بیدلؔ لائبریری) اور دبئی میں مقیم جونؔ ایلیا کے نیاز مند ارشد حسین (نظم ''زمستان'' مہیا کی) کو اپنے شکریے کا مستحق سمجھتا ہوں، جنہوں نے مختلف ادبی رسائل سے اہم مواد کی فراہمی میں بے حد تعاون کیا۔

محترم جناب قمر رضی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری کوششوں کو سراہا اور حوصلہ افزائی کی۔ محترم جناب ممتاز سعید (ثمن بھائی) کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس کلام کو دیکھا اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔ محترم جناب پروفیسر طہیر نفسی، سیّد سلیم ساجد کرنؔ، آغا وسیم، محترم عمر زمان، زریون ایلیاؔ اور تھیٹر کے ڈاکٹر ایس، این، ایم شہزاد کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے اِس مجموعہ کی تکمیل کے تمام مراحل میں حسبِ روایت بھرپور ساتھ دیا۔

رابطہ: jaun_elia@yahoo.com

میں پیاپے جو موجود ہوں
صرف موجود ہوں
صرف موجود ہونے کی حالت میں ہونے کو جو حوصلہ چاہیے
وہ خدایاں خدا میں بھی شاید نہ ہو
عنکبوتِ رواقِ کہن کا مرے یہ مقولہ ہے:
ہے بھی نہیں
اور تھا بھی نہیں

نہیں شوریدگانِ شہر میں وہ سوزِ جاں اب کے
ہیں شامیں سوختہ جانوں کی بے شورِ فغاں اب کے
ہیں شوقِ گرمیٔ آغوش کے جذبے زمستانی
شب اندر شب ہو جیسے برفباری کا سماں اب کے
کوئی لہجہ یہاں شعلے پہن کے اب نہیں آتا
نہیں سایہ فگن محفل پہ سانسوں کا دھواں اب کے
سرود و ساز ہیں سرما فروشِ حلقۂ یاراں
دِلوں میں زمہریری کپکپی ہے پُرفشاں اب کے
ستم ہے رشتہ ہائے آشتی کی پاسداری ہے
مرے یارو! تمہارے اور خدا کے درمیاں اب کے
لباسِ آتشِ انکارِ ابلیسی جلا ڈالا
یقیں کے ستر پوشانِ گماں نے بے گماں اب کے
ہوئی گُم اے گروہِ دل تپاں، آتش بجاں آخر

ترے احساس اور انفاس کی سوزش کہاں اب کے
ہے اِک خورشیدِ یخ بستہ کا پَرتو خاک پر غلطاں
ہیں زندہ دُھوپ کو ترسی ہوئی یہ بستیاں اب کے
سیاہی کی لپک ہے اور ہیں آتش کدے اپنے
کہاں پائیں فروغِ چشمِ جاں زردشتیاں اب کے
در و دیوار یخ ہیں اور ہوائیں زمہریری ہیں
لبِ شکوا کُھلے بھی تو صدائیں زمہریری ہیں
دلوں کی فصل برفانی ہے اور شیوے زمستانی
وفائیں زمہریری ہیں، جفائیں زمہریری ہیں
کِسے کِس سے گِلہ ہو اور گِلے کا کیا صلہ ٹھیرے
سماعت یخ زدہ ہے، التجائیں زمہریری ہیں
کیا خونِ جگر کا خوش گمانی میں زیاں ہم نے
شفق کے رنگ لکھے داستاں در داستاں ہم نے
فضا کہ ایسی برفانی کہ سانسیں جَم کے رہ جائیں
نہ کی ہوتی یہاں سینے کی گرمی رائگاں ہم نے
نفس ٹھٹھرے ہوئے ہیں شعلہ ہائے لب کے موسم میں
مجھے سردی زیادہ ہی لگے گی اب کے موسم میں

فونیس

آلِ ققنس میں فونیس* کا کوئی ثانی نہ تھا
اور الحق کہ یہ قولِ حق ہے جو ہے
امرِ تاریخ و انساب جو ہے وہ ہے
ہشت صد سال تک اس نے دلّی میں
لاہور میں، اور ازاں بعد طرس و بخارا میں
طرطوس میں اور حلب میں علوم و فنونِ قدیمہ
کے فاضل ترین اہلِ دانش کی صحبت سے
دانش فزا استفادہ کیا تھا
وہ طائرِ عجب دانش افروز تھا
بینش آموز تھا

*PHOENIX

○

میرے جَد سے، نصیرِ سخن شاعرِ نغز فن
میر شایانِ امروہوی سے روایت ہے
جو مجھ تلک اپنے بابائے درویش افتاد
علامۂ ایلیا سے بہ تفصیل پہنچی ہے
یہ ہے کہ غفراں ماب اور مغفور کی آل سے
اور اربابِ علم "فرنگی محل" سے اُسے
وہ عقیدت تھی جس کی مثالیں اگر ہیں تو وہ
شاذ ہیں
بعض ہیں

○

غدر کے بعد کا ذکر ہے جب وہ دلّی سے
نالہ کناں پَر زناں شہرِ امروہہ آیا تو
نشّے میں تھا
آپ میں گم شدہ

○

ایک دن میر شایاں کے ''قبلہ میاں باوا صاحب''
امیر الحسینی
امیرِ سخن
صحنِ بالا سے جب صحنِ زیریں میں اُترے تو وہ
ناگہاں رُک گئے اور وہ یوں کہ شہتوت کی
شاخ پر خاندانِ فرہ مندِ قُقنس کا فرزند
فونیس مخمور بیٹھا ہوا رو رہا تھا
اُنہوں نے اِسے اور اِس نے اُنہیں
جوں ہی دیکھا تو سمجھو پلک بھر میں اِک
مجلسِ زخم ہا زخمِ گریاں بپا ہوگئی
ایک سوزندہ تر حالتِ غم دوتا ہوگئی

○

آلِ قُقنس کے فرزند فونیس تم بے طرح
مست و مخمور ہو لیکن اب جو بھی کچھ ہے
وہ یک سر درست و بجا ہے
کہ ہم سب بھی اب خون کے گھونٹ پیتے ہیں

اپنی صدی ہا صدی کی ہزیمت میں جیتے ہیں
ہم کیا کریں، وائے ہو ہم پہ، ہم کیا کریں
اپنے صیدا و واسطہ سے
پنجاب، زاں بعد دوآبہ آنے پہ گریہ کریں؟

○

اندریں حال فونیس دُھت ہو چکا تھا وہ
بغداد کا مرثیہ شیخ سعدی کا
زائیدۂ خامۂ خوں چکاں مرثیہ *
بے سروپا و بے وزن لہجے کی لکنت میں
رُک رُک کے تکرار کے ساتھ پڑھتا تھا
اور بُھول جاتا تھا
پھر کیا ہوا وہ بیک بار چونکا
پَر افشاں ہوا اور تب بعدِ آداب و تسلیم
پُر گریہ پُرنشہ لہجے میں یہ عرض کی:

---

* آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری ز خاک
سر بروں آر و قیامت در میانِ خلق بیں''
(سعدی)

سیّدی! مجھ پہ لعنت ہو
اور آلِ قُقنس کے ایک اِک نفر پر
فرشتوں کی اور اِنس و جن کی
شب و روز لعنت ہو!
میں آج اس حال میں آپ کے رُو برُو ہوں
مگر کیا کروں، حیف صد حیف، میں کیا کروں
سیّدی! آپ سرکارِ کونین کی آل ہیں
آپ نفسِ رسالت جنابِ امیر
اور خاتونِ جنت کی عترت ہیں
ہم تو سبھی آپ کے خانوادے کے بندے ہیں
پاپوش بوسوں میں ہیں
حضرتِ قنبرِ پاک ذات
اور مخدومہ فضّہ کی سوگند
اس دوزخی، اس سیہ کار نے
اس مہینے سے پہلے
چکھی تک نہ تھی
سیّدی! اُس قیامت کے بارے میں جو آپ پر

آپ کی نسبتِ عالیہ کے سبب
مجھ پہ گُزری ہے میں آلِ قُقنس کا ہندی نژاد
ایک طائرٗ فرومایہ طائرٗ بھلا کیا کہوں
میں یہ کیسے چُھپاؤں کہ اب میں بَلا نوش ہوں
خود کشی کوش ہوں

○

مجھ کو دِلّی میں بارود کی ریگ آمیز
بارود کی بُوے غدّار نے
زہر پلوایا ہے، خون رُلوایا ہے
واے وہ ساعتِ حشر جب کالے خاں
گولا انداز ساکت تھا سکتے میں تھا
میں جہت ہا جہت سوختہ
داغ ہا داغ ہاے دل اندوختہ
خون کے گھونٹ پیتا رہا اور جیتا رہا
بخت خاں کے سہارے پہ جیتا رہا
اور پورب کے پُر دل جوانوں کی سَر زَن
شہابی شہامت کا اِک آسرا تھا

کہ میں شورِ ہیجا پہ پرواز کرتا ہوا
سوئے اُمیدِ تاریکِ آئندہ بڑھتا رہا
جو شنینِ صغیر و کبیر
اپنے باطن میں پڑھتا رہا

○

آپ شاعر ہیں اور اِس غلامِ کمینہ کو اس وقت
محضر میں سرکار کے ایک فریاد
کرنا ہے جو دل کی فریاد ہے
جاں کی فریاد ہے
نسل ہا نسل کے
داغ ہا داغِ سوزاں کی فریاد ہے
اِن دنوں ایک شاعر نے، دلّی کے شاعر نے ـــــ
میں تو اُسے اب شُویعر کہوں گا
جو ایک ہے جرگے سے اتراک کے
ایسے جرگے سے جو ایک دو نسل پہلے ہی اس
سرزمینِ فلک رفعتِ ہند میں
آ کے ٹھہرا تھا ـــــ

وہ کچھ کہا
جو کم از کم شریفوں کو زیبا نہیں
شخصِ مذکور دُزدِ دلاور ہے
طرزِ شگفت آور طرزِ بیدل کا
یا سیّدی! کیا یہ بندے کی بکواس ہے؟
اُس نے اُردو سے اس کی پھبن چھین لی
ہائے اپنے خدائے سخن میر طاب ثراہٗ
وہ اِس قرن کے فیلسوفِ گراں مایہ تر
عالمِ عالماں حضرتِ فضلِ حق
کے جہدِ لسان و عمل کی شب و روز
تفحیک کرتا رہا
کتنا نیچے اترتا رہا
آدمی میں وفاداریِ دین و دنیا تو ہو
رات سوئے تو سنّی تھے جاگے تو شیعہ تھے
استغفراللہ
دعوا بہ تکرار دعوا ہے دعوا
میں بندہ علی کا ہوں منصور ہوں

اُس گروہِ حقیقت رسِ سرِّ ایماں کا
جو نورِ ذاتِ علی کو خدا مانتا ہے
یہ کس طور کی بندگی ہے؟
یہ بوجہل کی بندگی ہے کہ انسان
اپنے مربی کی' روزی رساں کی
نکوہش کرے
''شاعرِ بے بدل'' روز و شب
پیر و مرشد کی بدگوئی کرتا رہا

○

مجھ کو کہنا تھا کچھ اور میں اپنی حالت میں
کچھ اور ہی کہہ گیا
سیّدی! بخت خاں پیر و مرشد کی خدمت سے جب
ایک خوں گشتہ پیکر کی صورت نگوں سر
ہمیشہ خموشی ازل ہا ابد ہا کی
پسپائی کی جاں گزا سوگ وارانہ حالت میں
اپنے فرس پر
حصارِ مزارِ ہمایوں سے رخصت ہوا ہے
تو میں بھی بلندی پہ

نالہ کناں پَرزَناں تھا
مرے حال پر وَیل ہو وَیل ہو سیّدی!
میں نے اور اُس نے دلّی کو اِک ساتھ چھوڑا
وہ اِک حال تھا جانے کیا حال تھا
جو گزرتا نہیں سیّدی
جو گزرتا نہیں

○

میں جو اَب ایک رُسوا کنِ آلِ قُقنس ہوں
بائیس خواجہ کی چوکھٹ کا' اپنے پر و بال سے
ایک جارُوب کش' اِک مجاور رہا ہوں
مگر اب میں روزانہ پیتا ہوں روزانہ
اپنے تنفّس کی بخشش سے زہرِ ہلاہل
کی نعمت پہ جیتا ہوں
اور اب مری زندگی کا ہزارہ تمامی پہ ہے
والسلام علی من یحب الصناء
والسلام علی من یرید الوفاء

وہ روایت جو بابائے علام سے مجھ تک آئی ہے
اس کا یہ اِتمام ہے

راتیں سچّی ہیں، دن جھوٹے ہیں

چاہے تم میری بینائی کُھرچ ڈالو، میں پھر بھی اپنے خواب نہیں چھوڑوں گا
اِن کی لذت اور اذّیت سے میں اپنا کوئی عہد نہیں توڑوں گا
تیز نظر نابیناؤں کی آبادی میں،
کیا میں اپنے دھیان کی یہ پونجی بھی گنوا دوں،
ہاں میرے خوابوں کو تمہاری صبحوں کی سرد اور سایہ گوں تعبیروں سے نفرت ہے
اِن صبحوں نے شام کے ہاتھوں اب تک جتنے سورج بیچے
وہ سب اِک برفانی بھاپ کی چمکیلی اور چکّر کھاتی گولائی تھے
سو میرے خوابوں کی راتیں، جلتی اور دہکتی راتیں
ایسی یخ بستہ تعبیروں کے ہر دن سے، اچھی ہیں اور سچّی بھی ہیں
جس میں دُھندلا چکّر کھاتا چمکیلا پن چھ اطراف کا روگ بنا ہے
میرے اندھیرے بھی سچّے ہیں
اور تمہارے ''روگ اُجالے'' بھی جھوٹے ہیں

راتیں سچّی ہیں، دن جھوٹے
جب تک دن جھوٹے ہیں، جب تک
راتیں سہنا اور اپنے خوابوں میں رہنا
خوابوں کو بہکانے والے دن کے اُجالوں سے اچھا ہے
ہاں میں بہکاؤوں کی دُھند نہیں اوڑھوں گا
چاہے تم میری بینائی کُھرچ ڈالو، میں پھر بھی اپنے خواب نہیں چھوڑوں گا
اپنا عہد نہیں توڑوں گا
یہی تو بس، میرا سب کچھ ہے
ماہ و سال کے غارت گر سے میری ٹھنی ہے
میری جان پر آن بنی ہے
چاہے کچھ ہو، میرے آخری سانس تلک اب چاہے کچھ ہو

سُراغ

خزاں نے شام گزاری ہے، میرے منظر میں
مرے تمام پرندے، تمام ہرکارے
مرے گمان کی سمتوں سے لوٹ آئے ہیں
مرے خیال، مرے خواب کے دیاروں کا
ہوائے سبز کے نمناک مرغزاروں کا
سراغ آج کی سمتوں میں بھی کہیں نہ مِلا
خزاں نے شام گزاری ہے، میرے منظر میں
شبِ سیاہ اُترتی ہے، میرے پیکر میں

بے معنی

ہے مری ذات اِک زیاں کی دکان
مجھ کو اپنا حساب کیا معلوم
جب مجھے بھی نہیں کوئی احساس
تم کو میرا عذاب کیا معلوم

ہر کسی سے بچھڑ گیا ہوں میں
کون دل میں مرا ملال رکھے
شہرِ ہستی کا اجنبی ہوں میں
کون آخر مرا خیال رکھے

رایگانی ہے زندگی میری
میں تو خود میں بھی رایگاں ہی گیا
بے گمانی سی بے گمانی ہے
مجھ سے تو خود مرا گماں ہی گیا

کوئی بھی مجھ کو آسرا نہ مِلا
میں بھٹکتا رہا ہوں شہروں میں
زندگی تشنگی کا دریا ہے
ہے فقط گرد دل کی لہروں میں

وصل کے سلسلے تو کیا اب تو
ہجر کے سلسلے ہیں بے معنیٰ
کوئی رشتہ ہی جب کسی سے نہیں
دل کے سارے گِلے ہیں بے معنیٰ

روز و شب اب یونہی گزرتے ہیں
کوئی قصہ ہو جان و جاناں کا
کربِ بے ماجرائی سہتا ہوں
کچھ تو ہو ماجرا دل و جاں کا

ہر نفس ہے کسی مفر کی تلاش
مجھ کو اپنے حصار میں لے لو
میرا اب خود پہ اختیار نہیں
تم مجھے اختیار میں لے لو

میرے اندر بھی دل کے در وا ہوں
یعنی میرے بھی کوئی معنی ہوں

عجب بات ہے

کچھ سُنا؟ آج بھی اِک عجب ماجرا پیش آیا
عجب ماجرا! یعنی کیا یعنی کیا؟
آج غیلان، غزّال، علاّف، کندی، ابونصر، بوبکر رازی و فرزند سینا و ایران شہری
ہمیشہ کے معنیٰ خو کردہ
شوریدہ سر ہیں سر آشفتہ ہیں
اور ایران شہری سا جنجال تو
آج بے طور و بے حال و پُر غوغا ہے
وہ سرِ شب سے پیہم پیے جا رہا ہے

○

مگر کیوں، بھلا آج کیا ماجرا پیش آیا ہے
یعنی کمون و بروزِ وجود و عدم میں بھلا آج کیا ماجرا پیش آیا ہے
کیا ماجرا پیش آیا ہے؟
یہ ماجرا پیش آیا ہے پُر ماجرا ماجرا
یعنی کل کی طرح آج بھی
آفتاب اپنے وقتِ مقرر پہ نکلا
عجب بات ہے یا نہیں؟
اور پھر جو ہوا وہ تو حیران کُن تر تھا
یعنی وہ کل کی طرح آج بھی
اپنے وقتِ مقرر پہ ڈوبا
عجب بات ہے یا نہیں؟
ہاں عجب بات ہے
یہ تو سچ مچ بہت ہی عجب بات ہے

فیصلہ

چار سُو مہرباں ہے چوراہہ
اجنبی شہر، اجنبی بازار
میری تحویل میں ہیں سمتیں چار
کوئی رستہ کہیں تو جاتا ہے
چار سُو مہرباں ہے چوراہہ

سرگرداں

(یوحنا کے نام)

میری محروم روح نے اب تک
نسل ہا نسل کا عذاب سہا
تھی وہ اِک جانکنی کی تنہائی
جس میں صدیاں گزار دیں میں نے
جانکنی جس کا خاردار لباس
میری فطرت کی جامہ زیبی نے
بے پس و پیش اختیار کیا
اور پھر یوں پہن لیا جیسے

یہ مرا جسم ہے لباس نہیں

○

تیرے غم نے پہن لیا ہے مجھے
اور میں تیرے پاس آیا ہوں
تُو نے مجھ کو پہچانا......؟
میں ہوں اس زندگی کا افسانہ
جو یہاں زخم کھانے آئی تھی
جس کی شہ رگ کو خون اُگلنا تھا
جس کی پوشاک پوستینِ خشن
کم بہا تر تھی اُن نیاموں سے
جو زیان و ضرر اُگلتی ہیں
آدمی اور زندگی کے لیے
زندگی جو فقط محبت تھی
اور انہوں نے اسے نہ پہچانا

○

تُو نے مجھ کو پہچانا
تیری صدیوں نے مجھ کو ڈھونڈا ہے

اجنبی انتظار کی صدیاں
نادمیدہ بہار کی صدیاں
تُو نے جن کی مشقتیں سہہ کر
بھری دنیا میں اجنبی رہ کر
اُن نگاہوں کا انتظار کیا
جن کو اِک بار بھی نہ دیکھا تھا
جن میں تیری خود آگہی کے لیے
اِک تبسّم تھا اور تبسّم میں
وقت کا رمزِ اشک افشاں تھا

○

وہ نگاہیں ترے دریچے کے
رُوبرُو تجھ سے ملنے آئی ہیں
اُن میں تیری خود آگہی کے لیے
اِک تبسّم ہے اور تبسّم میں
وقت کا رمزِ اشک افشاں ہے
اس تبسّم کا سرِّ بوقلموں
وقت کے دیر گرد چرواہے

شورہ بوموں سے سبزہ زاروں تک
سوچتے اور گاتے رہتے ہیں
اور اپنے میں بہہ رہا ہے وقت
وقت کا جبر سہہ رہا ہے وقت
آج جی بھر کے دیکھ لے مجھ کو
وقت سے ہیں بہت گِلے تجھ کو
وقت تیری غریب تنہائی
وقت خوابوں کی آبلہ پائی
خواب، تُو جن کو پا نہیں سکتی
خواب، جو تجھ کو پا نہیں سکتے
پر میں آنسو نہیں بہاؤں گا
سوچتا ہوں کہ یوں ترے دل میں
غم کا احساس بڑھ نہ جائے کہیں
غم سے بڑھتا ہے وقت کا احساس

○

خواب تجھ سے وداع ہوتے ہیں
اِن دریچوں کو بند کر لینا

میرے جانے کے بعد موجِ صبا
اور تجھ کو اُداس کر دے گی
ان دریچوں کو بند کر لینا
آہ! بے رحم وقت کی دیمک
ان دریچوں کو چاٹ جائے گی
میری محروم روح نے ......

اب ہمیں انقلاب چاہیے ہے

پاک و ہندوستان کے فنکارو
عقل و دیوانگی کے دلدارو
بن تمہارے ہے شوق کا رَمنا
تم سے ہے آبِ جہلم و جمنا
ہم جو ہیں کس قدر ہیں مالا مال
اے خوشا کالیداس اور اقبال
دل میں مست اور جاں میں مست رہیں
دونوں اپنے گماں میں مست ہیں
ہے عجب اِن کا اپنا اپنا طور

چشمِ بدور دلّی و لاہور
مادرِ وقت کی کمائی تو ہیں
یعنی آخر کو دونوں بھائی تو ہیں
کِس قدر بد نصیب ہیں دونوں
کہ نہایت غریب ہیں دونوں
یاں صلہ کچھ نہیں ہے محنت کا
چاہیے کچھ علاج غربت کا
خود ہی ہم ان میں کام آتے ہیں
سامراجی ہمیں لڑاتے ہیں
چاہیے موسیقی کا زیر و بم
کیسا ایٹم بھلا کہاں کا بم
فتنہ پرور ہیں ہاتف اور اگنی
دل کو یہ بات ہے بُری لگنی
کون کہتا ہے یہ سویرا ہے
دل کے گھر میں بڑا اندھیرا ہے
سو میں نوّے میاں جو بستے ہیں
ایک نوالے کو وہ ترستے ہیں

چارہ گر ہیں جو عیش کرتے ہیں
اور اُن کے مریض مرتے ہیں
ہیں جو لڑکے کتاب کو تکتے
کبھی اسکول جا نہیں سکتے
ہیں سوال اور جواب چاہیے ہے
اب ہمیں انقلاب چاہیے ہے

نوحہ

سبک بالانِ شامِ لاجوردیں سوے پہنائے شمالِ فرّو فرخندہ
شمالِ تیرہ سبزِ فرّو فرخندہ
پَرِش آغاز کرتے ہیں
نوا گر بے نوائی کو
گماں پرداز کرتے ہیں
گزشتِ وقت کو دم ساز کرتے ہیں

○

گماں کے صحن کی منظر فزائی کا ''ہمیشہ'' طَور پرور ہے
نوازش گر تمنا سے زمان و ذات کا رشتہ
عطش انگیز رشتہ
آزمایش خیز رشتہ
جوے جاں بخشِ گمان پُر گمانی میں شَنا گر ہے

○

سرودِ وقت کے بربادرفتہ "جاوداں تر" کی روانِ جاودانی
پائے کوئی، دست افشانی
کبھی کے ماجرا انگیز حالِ حالت احوالی میں زندہ ہے
جسے تقویم نے گُم کر دیا ہے
اور گرداگرد نسبت داریِ تاریخ کی بُودش کو گُم صُم کر دیا ہے

○

درِ نشاطِ یاد کے در، باز ہوتے ہیں
خموشی کے نفس آواز ہوتے ہیں
نوائے بےنوائے وجد انگیزِ رواں افروز
نزد و دورِ سبزہ زارِ جان و چشمہ سارِ جذبۂ دل میں
سماعت پروری کا خیمۂ موجود مستی نصب کرتی ہے

○

نوازش گر شمالِ تیرہ سبزِ فرّو فرخندہ بہت افسردہ ہے پُرشکوا ہے
اُن سے "ہمیشہ" میں جو بچھڑے ہیں
کوئی آوازہ خواں جب سوزشِ لب کو ہنر آمادہ کرتا ہے
تو اِک نوحہ پیاپے گریہ کرتا ہے

"دریغا! اُن کے لب کی شعلہ گفتاری کا حاصل ان کی خاکستر تھی
خاکستر، وہ خاکستر نہ جانے کس کی بالش، کس کا بستر تھی"

○

شمالِ تیرہ سبزِ فرّو فرخندہ کی رمز آگیں رواں افروزیِ جاوید
جس کو اک پُرغوغا جنایت کے سخن دانوں نے
خوں میں غرق کر ڈالا
دل و جاں میں بلا کا فرق کر ڈالا
شنا گر ہے ابھی تک روئے رودِ خوں شنا گر ہے
مگر اب جو بھی ہے وہ اُس کے دُنبالِ رواں تک نارسا تر ہے
اَیا حُزناہ! واویلا!
اَیا حزناہ! واویلا!
سبک بالانِ شامِ لاجوردیں سوئے پہنائے شمالِ فرّو فرخندہ
پَرِش آغاز کرتے ہیں

رشتۂ آدم و حوّا

میری معصوم فروزی، مری معبودۂ جاں
مِل گیا ہے مجھے مکتوبِ محبت کا جواب
اُس کے اندازِ نگارش سے پریشاں ہوں میں
وحشت افزا ہے مرے واسطے اسلوبِ خطاب
دیکھنا تھے مجھے شرمائے ہوئے کچھ جملے
مجھ کو احادیث و روایات نہیں سننا تھیں
دیکھنا تھا مجھے اِک جذبۂ کامل تم میں
مجھ کو قرآن کی آیات نہیں پڑھنا تھیں
تم نے لکھا ہے کہ تم بھائی سمجھتی ہو مجھے

آبِ زَم زَم سے کرو پُر نہ جوانی کا ایاغ
تم نے لکھا ہے کہ پاکیزہ محبت ہے مجھے
شمعِ کعبہ سے جلاؤ نہ مری شب کا چراغ
تم اگر بھائی سمجھتی ہو تو یہ بھی لِکھو
بھائی کے خط کو بھی چُھپ چُھپ کے پڑھا کرتے ہیں؟
تم اگر بھائی سمجھتی ہو تو یہ بھی بتلاؤ
بھائی کا نام بھی شرما کے لیا کرتے ہیں؟
میں نے سمجھا تھا مے نابِ تخیّل تم کو
اب یہ تقدیسِ تخیّل تو بڑی مشکل ہے
آؤ میں تم کو بتاؤں کہ محبت کیا ہے
حسرتِ لرزشِ بے جا کا مکمل احساس
مرد و عورت میں مری حُور ترے سر کی قسم
رشتۂ آدم و حوّا کے سِوا کچھ بھی نہیں

ہائے جمال احسانی

تُو نے یہ کیا کیا جمال آخر
اِس میں تھا کون سا کمال آخر
تجھ کو یہ کیسی نیند آئی ہے
یہ تو ہم سب سے بے وفائی ہے
آج ہے شاعری اُداس بہت
حُسنِ فن نے شکست کھائی ہے
دل نے دھڑکن کا ساتھ چھوڑا ہے
شمع نے روشنی گنوائی ہے
کِس سے اُس شخص کا گِلہ کیجیے

نہیں آتا سمجھ میں کیا کیجیے
جاں فزا صبح و شام کی یادو
تم نہ دل کو مرے سہارا دو
اے مرے داغ ہائے دل مجھ کو
اپنی سوزش سے اور ایذا دو
آج کا دن نہیں شراب کا دن
آج تو مجھ کو زہر پِلوا دو
یہ جنازہ جمالِ فن کا ہے
اہلِ فن اِس کو بڑھ کے کاندھا دو
اِس کو کرنا ہے اِک غزل تحریر
قبر میں روشنی تو پہنچا دو
کیسا نقصان ہو گیا اپنا
شہر سنسان ہو گیا اپنا
زندگی کیا ہے صرف ایک ٹھٹھول
اِس کو میزانِ فکر میں مت تول
موت ہے اور ہوس خرید کی ہے
اور کچھ بھی نہیں یہاں انمول

ہے اگر سوچنا تو کچھ مت سوچ
ہے اگر بولنا تو کچھ مت بول
لمحہ لمحہ پڑھا کرے انسان
نوحۂ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

فن پارہ

یہ کتابوں کی صف بہ صف جلدیں
کاغذوں کا فضول استعمال
روشنائی کا شاندار اسراف
سیدھے سیدھے سے کچھ سیہ دھبے
جن کی توجیہہ آج تک نہ ہوئی

O

چند خوش ذوق کم نصیبوں نے
بسر اوقات کے لیے شاید
یہ لکیریں بکھیر ڈالی ہیں

کتنی ہی بے قصور نسلوں نے
ان کو پڑھنے کے جرم میں تا عمر
لے کے کشکولِ علم و حکمت و فن
کُو بہ کُو جاں کی بھیک مانگی ہے

○

آہ! یہ وقت کا عذابِ الیم
وقت، خلّاق، بے شعور، قدیم
ساری تعریفیں اُن اندھیروں کی
جن میں پَرتو نہ کوئی پرچھائی
آہ! یہ زندگی کی تنہائی
سوچنا اور سوچتے رہنا
چند معصوم پاگلوں کی سزا

آج میں نے بھی سوچ رکھا ہے
وقت سے انتقام لینے کو
یونہی تا شام سادے کاغذ پر
ٹیڑھے ٹیڑھے خطوط کھینچے جائیں

دوسرا خواب پہلے خواب کے شہر میں

کہا جائے گا تم سے یہ وہ شہرِ رنگ ہے جس میں
ہمارے شاعرِ حرماں نصیبِ جاں
ہمارے ہنصدِ امروز و فردا کے نوا خواں نے
تمہارے شاعرِ روزی طلب، فن کے فسوں گر پیشہ پیماں نے
ازل میں اپنی ذاتِ رمز پرور کے ازل میں
اپنا خوابِ ماجرا انگیز یاقوت و زمرد فام دیکھا تھا
عجب اِک خواب یاقوت و زمرد فامِ پُر الہام دیکھا تھا

○

تم اُس شاعر کے خوابِ اوّلیں کے شہر میں آئی ہو
خوابِ اوّلیں جس کا دل و جاں نازنیں پیکر
سراپا ایک محشر ماجرا تھا
اور شاعر اپنے شہرِ جاوداں کے سارے خوابوں کی
فضا میں نغمہ خوان و پُرنوا رہتا تھا
اُس کی نغمہ خوانی پُرنوائی
شہر کو پُرحال رکھتی تھی

○

یہاں کے صحن و دالانِ شبانہ آج بھی شاعر کے خوابِ اوّلین نازنین
کی حال آ گیں حالتوں کو طرح کرتے ہیں
اب اُس شاعر کی یادیں رہ گئی ہیں، داستانیں رہ گئی ہیں
جانے والے خود چلے جاتے ہیں
اور اپنی داستانیں، اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں

○

دریچے وہ دریچے جن سے اُس شاعر کے
خوابِ اوّلیں کا جاوداں ہنگام رشتہ تھا
انہیں اب اپنی بینائی گنوائے اِک زمانہ ہو چکا ہے
اِک زمانہ
ایک بیگانہ زمانہ
اور اس کا ایک آزردہ فسانہ
اور اب تم اُس فسانے کی تمامی بَن کے آئی ہو
تم اس صد حال ہنگامہ زمانے کی تمامی بَن کے آئی ہو
یہاں سے جا کے اس غربت زدہ شاعر کو اپنے شہر میں ناشادمت کرنا
اسے بربادمت کرنا

لیکن......

ہمیں شکست ہوئی ہے، یہ ہم بھی جانتے ہیں
ہم آج سو نہ سکیں گے، یہ تم بھی جانتے ہو
مگر یہ بات کہ یہ شام آخری تو نہ تھی
یہ بات ہم ہی نہیں، دوسرے بھی مانتے ہیں

میں تو خدا کے ساتھ ہوں، تم کِس کے ساتھ ہو؟
ہر لحہ ''لا'' کے ساتھ ہوں، تم کِس کے ساتھ ہو؟

مجھ کو بقائے عیشِ تو ہم نہیں قبول
میں تو ''فنا'' کے ساتھ ہوں، تم کِس کے ساتھ ہو؟

میں ہوں بھی یا نہیں ہوں، عجب ہے مرا عذاب
ہر لحہ ''یا'' کے ساتھ ہوں، تم کِس کے ساتھ ہو؟

میں ہوں غُبارِ جادۂ بُود و نبُود کا
یعنی ہوا کے ساتھ ہوں، تم کِس کے ساتھ ہو؟

تم بھی تو آج مجھ سے کرو کچھ سخن کہ میں
نفیِ اَنا کے ساتھ ہوں، تم کِس کے ساتھ ہو؟

موسم مرا کوئی بھی نہیں اس زمین میں
آب و ہوا کے ساتھ ہوں، تم کِس کے ساتھ ہو؟

○

اے نفس آشفتگاں ! شہر بگولوں کا ہے
رہیو بہم خود میں یہاں، شہر بگولوں کا ہے

دُھول ہے ساری زمیں، دُھند ہے سب آسماں
شکل کی صورت کہاں ؟ شہر بگولوں کا ہے

گرد کی شکلیں سی دو ہونے کو ہیں ہمکنار
بیچ میں ہیں آندھیاں، شہر بگولوں کا ہے

گرد ہیں تعمیر کی ساری فلک بوسیاں
گرد میں ہُو کا مکاں، شہر بگولوں کا ہے

ہیں اسی دَم رُوبرُو، پھر نہ کوئی میں نہ تُو
اُس پہ یہ وعدے بھی جاں؟ شہر بگولوں کا ہے

اب سے ہے جو اَب تلک، سُود میں ہے وہ پلک
کِس کا زیاں، کیا زیاں، شہر بگولوں کا ہے

ایک نفس ہی سہی، اس کی ہوس ہی سہی
رشتہ ہو اِک درمیاں، شہر بگولوں کا ہے

دُھند ہے بکھراؤ ہے، دُھول ہے اندھیاؤ ہے
خود سے لگا چل میاں، شہر بگولوں کا ہے

ہائیں یہ آشفتگی، پائے نہ جاؤ گے پھر
شہر یہ آشفتگاں، شہر بگولوں کا ہے

وہمِ گماں کا گماں، عیشِ یقیں ہے یہاں
یہ بھی گماں ہے گماں، شہر بگولوں کا ہے

○

بجا اِرشاد فرمایا گیا ہے
کہ مجھ کو یاد فرمایا گیا ہے

عنایت کی ہیں ناممکن اُمیدیں
کرم ایجاد فرمایا گیا ہے

ہیں اب ہم اور زَد ہے حادثوں کی
ہمیں آزاد فرمایا گیا ہے

ذرا اُس کی پُراحوالی تو دیکھیں
جسے برباد فرمایا گیا ہے

نسیمِ سبزگی تھے ہم سو ہم کو
غُبار اُفتاد فرمایا گیا ہے

مبارک فالِ نیک اے خسروِ شہر!
مجھے فرہاد فرمایا گیا ہے

سند بخشی ہے عشقِ بے غرض کی
بہت ہی شاد فرمایا گیا ہے

سلیقے کو لبِ فریاد تیرے
ادا کی داد فرمایا گیا ہے

کہاں ہم اور کہاں حُسنِ سرِ بام
ہمیں بنیاد فرمایا گیا ہے

○

بول رے جی اب ساجن جی کا، مکھڑا ہے کس درپن کا
میں جو ٹوٹا، میں جو بکھرا، میں تھا درپن ساجن کا

جب تجھ سے ناتا ٹوٹا تو پھر اپنے سے کیا ناتا
پر اب بھی تو اِک ناتا ہے، وہ ناتا ہے اَن بَن کا

میرا دل ہے ساگر ایسا، تم ندیوں کے مان میں ہو
میں بھی اپنی گنگا کا ہوں، میں بھی اپنی کانگن کا

مجھ کو میرے سارے کھلونے لا کے دو میں کیا جانوں
کیسی جوانی، کس کی جوانی، میں ہوں اپنے بچپن کا

بیچ میں آنے والے تو بس بَن کارن ہلکان ہوئے
سیّد جی تھا سارا کھیل، تمہارا اور برہمن کا

جو بھی ہو گا اُس نے کوئی دامن تھام رکھا ہو گا
جانے میرا ہاتھ ہے یارو، کس دِلبر کے دامن کا

اس جوگن کے روپ ہزاروں، اُن میں سے ایک رُوپ ہے تُو
جب سے میں نے جوگ لیا ہے، جوگی ہوں اُس جوگن کا

چلمن پیچھے اِک چلمن ہے آنکھوں سے آکاش تلک
جو تیری دیکھن میں آیا، تھا وہ جھلکا چلمن کا

کیا بتلاؤ اس سے لڑنے بھڑنے میں جو لیلا تھی
لڑنا تھا اس من موہن سے میرا کھیل لڑکپن کا

تُو جو دریچے سے آتی ہے کیوں میں تجھ کو آنے دوں
کوئی بگولا لائی ہے کیا تُو، بادِ صبا اُس آنگن کا

جوؔن بڑا ہرجائی نکلا، پر وہ تو بیراگی تھا
ایک رسیلی، ایک انیلی، البیلی امروہن * کا

---

* امروہہ کی رہنے والی

جب وہ ناز آفریں نظر آیا
سارا گھر احمریں نظر آیا

میں نے جب بھی نگاہ کی تو مجھے
اپنا گُل شبنمی نظر آیا

حسبِ خواہش میں اُس سے ملتے وقت
سخت اندوہ گیں نظر آیا

گرم گُفتار ہے وہ کم گُفتار
کیا اُسے میں نہیں نظر آیا

وقتِ رخصت، دمِ سکوت اور صحن
آج چرخِ بریں نظر آیا

شہر ہا شہر گھومنے والو !
تم کو وہ بھی کہیں نظر آیا

اُس کو گُم کر کے اپنا ہر دُرِ اشک
ننگِ ہر آستیں نظر آیا

کون آیا ہے دیکھ تیرہ نگاہ!
نظر آیا ؟ نہیں نظر آیا

تُو مجھے اے مرے فروغِ نگاہ !
اب دَمِ واپسیں نظر آیا

○

رنگ ہے رنگ سے تہی، اس کا شمار کیا بھلا
سب یہ ہنر ہے دید کا، نقش و نگار کیا بھلا

دائرۂ نگاہ میں تُو کہ ہے میرے رُوبرُو
ہے تری رُوبرُوئی، دائرہ وار کیا بھلا

دل کی یہ ہار بھی تو ایک طور ہے زندگی کا یار
یوں بھی ہے دل خود اپنی ہار، ہار کی ہار کیا بھلا

ہے یہ قرارگاہِ بُود، ایک فرارِ صد نمود
اِس میں فرار کیا بھلا، اس سے فرار کیا بھلا

یوں تو سو طرح میں خود اپنی پہنچ سے سے پار ہوں
وہ جو پہنچ کے پار ہے، اس کے ہے پار کیا بھلا

ہے یہ غُبارِ روشنی، نسل و نژاد تیرگی
جیبِ غُبار میں بجز، موجِ غُبار کیا بھلا

عرصۂ دو نفس کے بیچ، کون تھا میں، میں کون ہوں؟
تُو بھی وہی ہے وہ جو تھا، اے مرے یار کیا بھلا!

کیف بہ کیف کم بہ کم دور بدور دم بدم
حالتِ رَم بہ رَم میں ہے، قرب و جوار کیا بھلا

○

شرمندگی ہے ہم کو بہت ہم مِلے تمہیں
تم سر بہ سر خوشی تھے مگر غم مِلے تمہیں

میں اپنے آپ میں نہ مِلا اس کا غم نہیں
غم تو یہ ہے کہ تم بھی بہت کم مِلے تمہیں

ہے جو ہمارا ایک حساب اُس حساب سے
آتی ہے ہم کو شرم کہ پیہم مِلے تمہیں

تم کو جہانِ شوق و تمنا میں کیا مِلا
ہم بھی مِلے تو درہم و برہم مِلے تمہیں

اب اپنے طور ہی میں نہیں تم سو کاش کہ
خود میں خود اپنا طور کوئی دَم مِلے تمہیں

اس شہرِ حیلہ جُو میں جو محرم مِلے مجھے
فریاد جانِ جاں وہی محرم مِلے تمہیں

دیتا ہوں تم کو خشکیِ مژگاں کی میں دُعا
مطلب یہ ہے کہ دامنِ پُرنم مِلے تمہیں

میں اُن میں آج تک کبھی پایا نہیں گیا
جاناں! جو میرے شوق کے عالم مِلے تمہیں

تم نے ہمارے دل میں بہت دن سفر کیا
شرمندہ ہیں کہ اُس میں بہت خَم مِلے تمہیں

یوں ہو کہ اور ہی کوئی حوّا مِلے مجھے
ہو یوں کہ اور ہی کوئی آدم مِلے تمہیں

○

نہ تو دل کا، نہ جاں کا دفتر ہے
زندگی اِک زیاں کا دفتر ہے

پڑھ رہا ہوں میں کاغذاتِ وجود
اور نہیں اور ہاں کا دفتر ہے

کوئی سوچے تو سوزِ کربِ جاں
سارا دفتر گماں کا دفتر ہے

ہم میں سے کوئی تو کرے اِصرار
کہ زمیں، آسماں کا دفتر ہے

ہجر، تعطیلِ جسم و جاں ہے میاں
وصل، جسم اور جاں کا دفتر ہے

وہ جو دفتر ہے آسمانی تر
وہ میاں جی یہاں کا دفتر ہے

ہے جو بُود و نبُود کا دفتر
آخرش یہ کہاں کا دفتر ہے

جو حقیقت ہے دَم بہ دَم کی یاد
وہ تو اِک داستاں کا دفتر ہے

ہو رہا ہے گزشتگاں کا حساب
اور آئیندگاں کا دفتر ہے

○

مظلوم حسرتوں کے سہاروں کا ساتھ دو
باہر نکل کے سینہ فگاروں کا ساتھ دو

اک معرکہ بہار و خزاں میں ہے ان دنُوں
سب کچھ نثار کر کے بہاروں کا ساتھ دو

تم کو حریمِ دیدہ و دل ہے اگر عزیز
شہروں کے ساتھ آؤ، دیاروں کا ساتھ دو

آبادیوں سے عرض ہے، شہروں سے التماس
اِس وقت اپنے کارگزاروں کا ساتھ دو

زخموں سے جن کے پھوٹ رہی ہے شعاعِ رنگ
اُن حُسن پروروں کی قطاروں کا ساتھ دو

روشن گروں نے خوں سے جلائی ہیں مشعلیں
اُن مشعلوں کے سُرخ اِشاروں کا ساتھ دو

بیدار رہ کے آخرِ شب کے حصار میں
خورشید کے جریدہ نگاروں کا ساتھ دو

یاروں کا اِک ہجوم چلا ہے کفن بدوش
ہے آج روزِ واقعہ' یاروں کا ساتھ دو

○

جو حال خیز ہو دل کا' وہ حال ہے بھی نہیں
فغاں کہ اب وہ ملالِ ملال ہے بھی نہیں

تُو آ کے بے سروکارانہ مار ڈال مجھے
کہ تیغ تھی بھی نہیں اور ڈھال ہے بھی نہیں

مرا زوال ہے اس کے کمال کا حاصل
مرا زوال تو میرا زوال ہے بھی نہیں

کیا تھا جو لبِ خونیں سے اس پہ میں نے سُخن
کمال تھا بھی نہیں اور کمال ہے بھی نہیں

وہ اِک عجیب زلیخا ہے یعنی بے یوسف
ہمارے مصر میں اس کی مثال ہے بھی نہیں

جو تیرا جلوہ ہے وہ بام پر ہی سجتا ہے
میں خلوتی ہوں، تُو میرا سوال ہے بھی نہیں

تُو ایک کہنہ متاعِ دکانِ شرم ہے، شرم
ترے بدن کا کوئی حال، حال ہے بھی نہیں

وہ کیا تھی ایک عروسِ ہزار شوہر تھی
سو اب مجھے غمِ ہجر و وصال ہے بھی نہیں

تری گلی میں تو کوڑے کے ڈھیر ہیں جب سے
تری گلی میں کمینوں کا کال ہے بھی نہیں

○

آخری بار آہ کر لی ہے
میں نے خود سے نباہ کر لی ہے

اپنے سر اِک بلا تو لینی تھی
میں نے وہ زُلف اپنے سر لی ہے

دن بھلا کس طرح گزارو گے
وصل کی شب بھی اب گزر لی ہے

جاں نثاروں پہ وار کیا کرنا
میں نے بس ہاتھ میں سِپر لی ہے

جو بھی مانگو اُدھار دوں گا میں
اُس گلی میں دکان کر لی ہے

میرا کشکول کب سے خالی تھا
میں نے اُس میں شراب بھر لی ہے

اور تو کچھ نہیں کیا میں نے
اپنی حالت تباہ کر لی ہے

شیخ آیا تھا محتسب کو لیے
میں نے بھی اُن کی وہ خبر لی ہے

○

سخن آتے ہیں اُس کے یاد بہت
دل کو تھا اُس سے اتحاد بہت

جب بھی چلتی ہے اُس طرف سے ہوا
شور کرتے ہیں نامُراد بہت

حُسن پر اس کے نکتہ چیں ہی رہے
تھا طبیعت میں اجتہاد بہت

درمیانِ ہجومِ مُشتاقاں
اُس گلی میں رہے فساد بہت

اُس کا روزِ سفر اور آج کی شام
درمیاں میں ہے امتداد بہت

مجھ سے اِک بادیہ نشیں نے کہا
شہر والے ہیں بدنہاد بہت

زخمِ دل کو بناؤ زخمۂ ساز
بستیوں میں مِلے گی داد بہت

جونؔ اسلامیوں سے بحث نہ کر
تُند ہیں یہ ثمود و عاد بہت

○

دل کو دنیا کا ہے سفر درپیش
اور چاروں طرف ہے گھر درپیش

ہے یہ عالم عجیب اور یہاں
ماجرا ہے عجیب تر درپیش

دو جہاں سے گُزر گیا پھر بھی
میں رہا خود کو عمر بھر درپیش

اب میں کوئے عبث شتاب چلوں
کئی اِک کام ہیں اُدھر درپیش

اس کے دیدار کی اُمید کہاں
جبکہ ہے دید کو نظر درپیش

اب مری جان بچ گئی یعنی
ایک قاتل کی ہے سپر درپیش

کس طرح کوچ پر کمر باندھوں
ایک رہزن کی ہے کمر درپیش

خلوتِ ناز اور آئینہ
خود نگر کو ہے خود نگر درپیش

ہم جان و دل سے یار تھے، ہم کون تھے، ہم کون تھے
ہم میں سے کچھ دلدار تھے، ہم کون تھے، ہم کون تھے

آسان تھے سب کے لیے جیسے سخن لب کے لیے
اپنے لیے دشوار تھے، ہم کون تھے، ہم کون تھے

اپنے سے ہم کو بیر تھا، خود اپنا آپا غیر تھا
اپنے سے ہم بیزار تھے، ہم کون تھے، ہم کون تھے

ہم کون تھے ہم کون تھے، اندر سے تھے گلزار ہم
باہر سے ہم پُر خار تھے، ہم کون تھے، ہم کون تھے

رنگیں اداؤں کے لیے، شیریں نواؤں کے لیے
ہم سر بہ سر آزار تھے، ہم کون تھے، ہم کون تھے

دل پریشاں ہے، کیا کیا جائے
عقل حیراں ہے، کیا کیا جائے

شوقِ مشکل پسند اُن کا حصول
سخت آساں ہے، کیا کیا جائے

عشقِ خوباں کے ساتھ ہی ہم میں
نازِ خوباں ہے، کیا کیا جائے

بے سبب ہی مری طبیعتِ غم
سب سے نالاں ہے، کیا کیا جائے

باوجود اُن کی دلنوازی کے
دل گریزاں ہے، کیا کیا جائے

میں تو نقدِ حیات لایا تھا
جنس ارزاں ہے، کیا کیا جائے

ہم سمجھتے تھے عشق کو دُشوار
یہ بھی آساں ہے، کیا کیا جائے

وہ بہاروں کی ناز پروردہ
ہم پہ نازاں ہے، کیا کیا جائے

مصرِ لطف و کرم میں بھی اے جونؔ
یادِ کنعاں ہے، کیا کیا جائے

ہم تھے نیازمندِ شوق، شوق نے ہم کو کیا دیا
صبح کا دُکھ بڑھا دیا، شام کا دُکھ بڑھا دیا

دن میں عذابِ ذات کے، تُو مرا ساتھ بھی تو دے
نیند تھی میری زندگی، تُو نے مجھے جگا دیا

واعظ و زاہد و فقیہہ، تم کو بتائے بھی تو کون
وہ بھی عجیب شخص تھا، جس نے ہمیں خدا دیا

تُو نے بھی اپنے خدّ و خال، جانے کہاں گنوا دیے
میں نے بھی اپنے خواب کو، جانے کہاں گنوا دیا

جانے وہ کاروانِ جاں، کیوں نہ گزر سکا جسے
تُو نے بھی راستہ دیا، میں نے بھی راستہ دیا

تُو مرا حوصلہ تو دیکھ، میں ہی کب اپنے ساتھ ہوں
تُو مرا کربِ جاں تو دیکھ، میں نے تجھے بُھلا دیا

ہم جو گِلہ گزار ہیں، کیوں نہ گِلہ گزار ہوں
میں نے بھی اُس کو کیا دیا، اُس نے بھی مجھ کو کیا دیا

قید کے کُھل رہے تھے دَر، وقت تھا دل نواز تر
رنگ کی موج آئی تھی، ہم نے اُسے گنوا دیا

ہم بھی خدا سے کم نہیں، جو اُسے ماننے لگے
وہ بھی خدا سے کم نہ تھا، جس نے ہمیں خدا دیا

○

نہ پُوچھ اُس کی جو اپنے اندر چُھپا
غنیمت کہ میں اپنے باہر چُھپا

مجھے یاں کسی پہ بھروسا نہیں
میں اپنی نگاہوں سے چُھپ کر چُھپا

پہنچ مخبروں کی سخن تک کہاں
سو میں اپنے ہونٹوں پہ اکثر چُھپا

مری سُن ! نہ رکھ اپنے پہلو میں دل
اسے تُو کسی اور کے گھر چُھپا

یہاں تیرے اندر نہیں میری خیر
مری جاں! مجھے میرے اندر چھپا

خیالوں کی آمد میں یہ آرجار
ہے پیروں کی یلغار، تُو سر چھپا

○

بے یک نگاہِ شوق بھی، اندازہ ہے، سو ہے
با صد ہزار رنگ، وہ بے غازہ ہے، سو ہے

ہوں شامِ حال یک طرفہ کا اُمیدِ مست
دستک؟ سو وہ نہیں ہے، پہ دروازہ ہے، سو ہے

آواز ہوں جو ہجرِ سماعت میں ہے سکوت
پر اس سکوت پر بھی اِک آوازہ ہے، سو ہے

اِک حالتِ جمال پہ جاں وارنے کو ہوں
صد حالتی مری، مری طنّازہ ہے، سو ہے

شوقِ یقیں گزیدہ ہے اب تک یقیں مرا
یہ بھی کسی گمان کا خمیازہ ہے، سو ہے

اس خلوتِ وصال میں یہ حسرتِ وصال
اِک خواہش وصال کی غمازہ ہے، سو ہے

تھی یک نگاہِ شوق مری تازگی رُبا
اپنے گماں میں اب بھی کوئی تازہ ہے، سو ہے

○

کیوں غم کریں جو شہر میں طوفانِ فتنہ ہے
ہے دستِ فتنہ اور گریبانِ فتنہ ہے

درمانِ فتنہ کے لیے ہے سر بہ جیب کیوں
فتنہ اُٹھا کہ فتنہ ہی درمانِ فتنہ ہے

لَب وا ہوئے کہ فتنہ فضا تا فضا پڑا
یہ جنبشِ نفس ہے کہ طغیانِ فتنہ ہے

بے جان ہیں یہ سارے بدن ہائے رقصِ شب
ہائے وہ اِک بدن جو بدن جانِ فتنہ ہے

مت جا قریب پاسِ نشیب و فراز کے
یہ پہلوئے فساد ہے' پستانِ فتنہ ہے

بھاگ اپنے سایے سے کہ بنایا گیا ہے یہ
سایے میں ایک پرتوِ پنہانِ فتنہ ہے

اس کے بدن میں کیسے اماں مِل گئی تجھے
جو تشنگی کی جان ہے' جانانِ فتنہ ہے

آثار تک نہیں کسی فتنے کے دُور تک
فارغ نہ بیٹھیو کہ یہی آنِ فتنہ ہے

نِکلا بھی جونؔ وقت پہ سورج گیا بھی ڈوب
آں سوے کہکشاں کوئی سامانِ فتنہ ہے

ایک سایہ مرا مسیحا تھا
کون جانے وہ کون تھا' کیا تھا

وہ فقط صحن تک ہی آتی تھی
میں بھی حجرے سے کم نکلتا تھا

تجھ کو بھولا نہیں وہ شخص کہ جو
تیری بانہوں میں بھی اکیلا تھا

جان لیوا تھیں خواہشیں ورنہ
وصل سے انتظار اچھا تھا

بات تو دل شکن ہے پر یارو!
عقل سچّی تھی، عشق جھوٹا تھا

اپنے معیار تک نہ پہنچا میں
مجھ کو خود پر بڑا بھروسہ تھا

جسم کی صاف گوئی کے باوصف
رُوح نے کتنا جھوٹ بولا تھا

دل نے وحشت گلی گلی کر لی
اب گِلہ کیا، بہت خوشی کر لی

یار! دل تو بلا کا تھا عیّاش
اس نے کس طرح خودکشی کر لی

نہیں آئیں گے اپنے بس میں ہم
ہم نے کوشش رہی سہی کر لی

اب تو مجھ کو پسند آ جاؤ
میں نے خود میں بہت کمی کر لی

یہ جو حالت ہے اپنی حالتِ زار
ہم نے خود اپنے آپ ہی کر لی

اب کریں کس کی بات ہم آخر
ہم نے تو اپنی بات بھی کر لی

قافلہ کب چلے گا خوابوں کا
ہم نے اِک اور نیند بھی کر لی

اُس کو یکسر بُھلا دیا پھر سے
یعنی بات کی ہوئی کر لی

آج بھی رات بھر کی بے خوابی
دلِ بیدار نے کھری کر لی

کیا خدا اُس سے دل لگی کرتا
ہم نے تو اُس سے بات بھی کر لی

ضبط کر کے ہنسی کو بُھول گیا
میں تو اُس زخم ہی کو بُھول گیا

ذات در ذات ہم سفر رہ کر
اجنبی ، اجنبی کو بُھول گیا

صبح تک وجہِ جانکنی تھی جو بات
میں اُسے شام ہی کو بُھول گیا

عہدِ وابستگی گزار کے میں
وجہِ وابستگی کو بُھول گیا

سب دلیلیں تو مجھ کو یاد رہیں
بحث کیا تھی اِسی کو بھول گیا

کیوں نہ ہو ناز اِس ذہانت پر
ایک میں، ہر کسی کو بھول گیا

سب سے پُر امن واقعہ یہ ہے
آدمی، آدمی کو بھول گیا

قہقہہ مارتے ہی دیوانہ
ہر غمِ زندگی کو بھول گیا

خواب ہا خواب جس کو چاہا تھا
رنگ ہا رنگ اُسی کو بھول گیا

کیا قیامت ہوئی اگر اِک شخص
اپنی خوش قسمتی کو بھول گیا

سوچ کر اُس کی خلوت انجمنی
واں میں اپنی کمی کو بھول گیا

سب بُرے مجھ کو یاد رہتے ہیں
جو بھلا تھا اُسی کو بھول گیا

اُن سے وعدہ تو کر لیا لیکن
اپنی کم فُرصتی کو بھول گیا

بستیو! اب تو راستہ دے دو
اب تو میں اُس گلی کو بھول گیا

اُس نے گویا مُجھی کو یاد رکھا
میں بھی گویا اُسی کو بھول گیا

یعنی تم وہ ہو، واقعی؟ حد ہے
میں تو سچ مچ سبھی کو بھول گیا

آخری بُت خدا نہ کیوں ٹھہرے
بُت شکن، بُت گری کو بھول گیا

اَب تو ہر بات یاد رہتی ہے
غالبًا میں کسی کو بھول گیا

اُس کی خوشیوں سے جلنے والا جونؔ
اپنی ایذا دہی کو بھول گیا

○

یارو ! نگہ یار کو، یاروں سے گِلہ ہے
خونیں جگروں، سینہ فِگاروں سے گِلہ ہے

جاں سے بھی گئے، بات بھی جاناں کی نہ سمجھی
جاناں کو بہت عشق کے ماروں سے گِلہ ہے

اب وصل ہو یا ہجر، نہ اب تک بسر آیا
اِک لمحہ، جسے لمحہ شماروں سے گِلہ ہے

اُڑتی ہے ہر اِک شور کے سینے سے خموشی
صحراؤں کو پُرشور دیاروں سے گِلہ ہے

بیکار کی اِک کارگزاری کے حسابوں
بیکار ہوں اور کارگزاروں سے گِلہ ہے

میں آس کی بستی میں گیا تھا سو یہ پایا
جو بھی ہے اُسے اپنے سہاروں سے گِلہ ہے

بے فصل اِشاروں سے ہوا خون جنوں کا
اُن شوخ نگاہوں کے اِشاروں سے گِلہ ہے

○

ہر خراشِ نفس، لکھے جاؤں
بس لکھے جاؤں، بس لکھے جاؤں

ہجر کی تیرگی میں روک کے سانس
روشنی کے برس لکھے جاؤں

اَن بسی بستیوں کا سارا لکھا
دُھول کے پیش و پس لکھے جاؤں

مجھ ہوس ناک سے ہے شرط کہ میں
بے حسی کی ہوس لکھے جاؤں

ہے جہاں تک خیال کی پرواز
میں وہاں تک قفس لکھے جاؤں

ہیں خس و خارِ دیدؔ رنگ کے رنگ
رنگ پر خار و خس لکھے جاؤں

کچھ کہوں، کچھ سنوں، ذرا ٹھہرو
ابھی زندوں میں ہوں، ذرا ٹھہرو

منظرِ جشنِ قتلِ عام کو میں
جھانک کر دیکھ لوں، ذرا ٹھہرو

مت نکلنا کہ ڈوب جاؤ گے
خوں ہے بس خوں ہی خوں، ذرا ٹھہرو

صورتِ حال اپنے باہر کی
ہے ابھی تک زبوں، ذرا ٹھہرو

ہاتھ سے اپنے لکھ کے نام اپنا
میں تمہیں سونپ دوں، ذرا ٹھہرو

میرا دروازہ توڑنے والو !
میں کہیں چھپ رہوں، ذرا ٹھہرو

○

وقت درماں پذیر تھا ہی نہیں
دل لگایا تھا، دل لگا ہی نہیں

ترکِ اُلفت ہے کس قدر آسان
آج تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں

ہے کہاں موجۂ صبا وہ شمیم
جیسے تُو موجۂ صبا ہی نہیں

جس سے کوئی خطا ہوئی ہو کبھی
ہم کو وہ آدمی مِلا ہی نہیں

وہ بھی کتنا کٹھن رہا ہو گا
جو کہ اچھا بھی تھا، بُرا ہی نہیں

کوئی دیکھے تو میرا حجرۂ ذات
یاں سبھی کچھ وہ تھا، جو تھا ہی نہیں

ایک ہی اپنا ملنے والا تھا
ایسا بچھڑا کہ پھر مِلا ہی نہیں

(۷)

دل کا دیارِ خواب میں، دُور تلک گزر رہا
پاؤں نہیں تھے درمیاں، آج بڑا سفر رہا

ہو نہ سکا کبھی ہمیں، اپنا خیال تک نصیب
نقش کسی خیال کا، لوحِ خیال پر رہا

نقش گروں سے چاہیے، نقش و نگار کا حساب
رنگ کی بات مت کرو، رنگ بہت بکھر رہا

جانے گماں کی وہ گلی، ایسی جگہ ہے کون سی
دیکھ رہے ہو تم کہ میں، پھر وہیں جا کے مر رہا

دل! مرے دل مجھے بھی تم اپنے خواص میں رکھو
یاراں تمہارے باب میں، میں ہی نہ معتبر رہا

شہرِ فراقِ یار سے آئی ہے اِک خبر مجھے
کوچۂ یادِ یار سے، کوئی نہیں اُبھر رہا

خونیں جگراں، سینہ فگاراں پہ نظر ہو
جاناں کبھی، ان کارگزاراں پہ نظر ہو

اے یار کسی شام، مرے یار کسی شام
بے رونقیٔ محفلِ یاراں پہ نظر ہو

یہ دفتری رنگ ہیں سرکارِ بہاراں
اِن زخم نگارانِ بہاراں پہ نظر ہو

رنگ ایک ہے قامت کئی اسکے ہیں سوائے دل
ساری ہی صفِ شوخ نگاراں پہ نظر ہو

جو تجھ سے بھی ہیں بے سروکار اب تری خاطر
آخر کبھی اُن بے سروکاراں پہ نظر ہو

جو نام شماراں ہیں ترے اہلِ وفا کے
جاناں! کبھی ان نام شماراں پہ نظر ہو

○

وہ کہکشاں، وہ رہِ رقصِ رنگ ہی نہ رہی
ہم اب کہیں بھی رہیں، جب تری گلی نہ رہی

تمہارے بعد کوئی خاص فرق تو نہ ہوا
بجزیں قدر کے وہ پہلی سی زندگی نہ رہی

یہ ذکر کیا کہ خرد میں بہت تصنّع ہے
ستم یہ ہے کہ جنوں میں بھی سادگی نہ رہی

قلمروِ غمِ جاناں ہوئی ہے جب سے تباہ
دل ونظر کی فضاؤں میں زندگی نہ رہی

نکال ڈالیے دل سے ہماری یادوں کو
یقین کیجیے ہم میں وہ بات ہی نہ رہی

جہاں فروز تھا یادش بخیر اپنا جنوں
پھر اُس کے بعد کسی شے میں دل کشی نہ رہی

دکھائیں کیا تمھیں داغوں کی لالہ انگیزی
گُزر گئیں وہ بہاریں، وہ فصل ہی نہ رہی

وہ ڈھونڈتے ہیں سرِ جادۂ اُمید کِسے
وہاں تو قافلے والوں کی گرد بھی نہ رہی

ر

ہو کے غلطاں خوں میں، کوئی شہسوار آیا تو کیا
زخم خوردہ بےقراری کو، قرار آیا تو کیا

زندگی کی دھوپ میں مُرجھا گیا میرا شباب
اب بہار آئی تو کیا، ابرِ بہار آیا تو کیا

میرے تیور بُجھ گئے، میری نگاہیں جَل گئیں
اب کوئی آئینہ رُو، آئینہ دار آیا تو کیا

اب کہ جب جانانہ تم کو ہے سبھی پر اعتبار
اب تمھیں جانانہ مجھ پر اعتبار آیا تو کیا

اب مجھے خود اپنی بانہوں پر نہیں ہے اختیار
ہاتھ پھیلائے کوئی بے اختیار آیا تو کیا

وہ تو اب بھی خواب ہے، بیدار بینائی کا خواب
زندگی میں خواب میں اس کے گزار آیا تو کیا

ہم یہاں بیگانہ ہیں سو ہم میں سے جونؔ ایلیا
کوئی جیت آیا یہاں اور کوئی ہار آیا تو کیا

○

ہر نفس پیچ و تاب ہے، تا حال
ہوسِ انقلاب ہے، تا حال

سیلِ خوں کا حساب ادا نہ ہوا
مجھ کو اُس سے حجاب ہے، تا حال

دل نے اُس کو لکھے ہیں سو مکتوب
انتظارِ جواب ہے، تا حال

خواب تو اب نہیں ہے یاد مگر
فکرِ تعبیرِ خواب ہے، تا حال

تُو نے پُوچھی نہ خیریت جس کی
حال اُس کا خراب ہے، تاحال

چارہ گر تُو جو دیکھ آیا تھا
بس وہی اضطراب ہے، تاحال

فاقہ مستو ! کماؤ نفعِ حلال
روزہ داری ثواب ہے، تاحال

ہے بجا وہ اگر بُرا مانے
عذرِ مستی شراب ہے، تاحال

ہوں معاشِ فریب سے محروم
وہی قحطِ سراب ہے، تاحال

○

جو رنج بھی مری جاں کو پہونچا
وہ میرے تئیں جہاں کو پہونچا

آواز سی کان میں اِک آئی
نقصان کسی زیاں کو پہونچا

ہاں سینہ بہ سینہ لب بہ لب جاں
پیغامِ گماں، گماں کو پہونچا

پرچھائیں نے دھوپ سے لیا سُود
ہر نفع یہاں، زیاں کو پہونچا

لو اس کا حساب تو جبیں سے
جو زخم کہ آستاں کو پہونچا

کیا قہر تھی جنبشِ پرِکاہ
صدمہ تھا جو کہکشاں کو پہونچا

تھا میرے بھی دُکھ سے کچھ زیادہ
وہ دُکھ جو حساب داں کو پہونچا

خونیں نفسی کے ہاتھ جاناں
خلعت ترے نغمہ خواں کو پہونچا

○

میرا میری ذات میں سودا ہوا
اور میں پھر بھی نہ شرمندہ ہوا

کیا سُناؤں سرگزشتِ زندگی
اِک سرائے میں تھا میں ٹھیرا ہوا

پاس تھا رشتوں کا جس بستی میں عام
میں اس بستی میں بے رشتہ ہوا

اِک گلی سے جب سے رُوٹھن ہے مری
میں ہوں سارے شہر سے رُوٹھا ہوا

پنج شنبہ اور دُکانِ مے فروش
کیا بتاؤں، کیسا ہنگامہ ہوا

تم میرا دُکھ بانٹ رہی ہو، میں دل میں شرمندہ ہوں
اپنے جھوٹے دُکھ سے تم کو کب تک دُکھ پہنچاؤں گا

تم تو وفا میں سرگرداں ہو، شوق میں رقصاں رہتی ہو
مجھ کو زوالِ شوق کا غم ہے، میں پاگل ہو جاؤں گا

جیت کے مجھ کو خوش مت ہونا، میں تو اِک پچھتاوا ہوں
کھوؤں گا، کُڑھتا ہی رہوں گا، پاؤں گا، پچھتاؤں گا

عہدِ رفاقت ٹھیک ہے لیکن، مجھ کو ایسا لگتا ہے
تم تو میرے ساتھ رہو گی، میں تنہا رہ جاؤں گا

شام کو اکثر بیٹھے بیٹھے، دل کچھ ڈوبنے لگتا ہے
تم مجھ کو اتنا مت چاہو، میں شاید مر جاؤں گا

عشق کسی منزل میں آ کر اتنا بھی بے فکر نہ ہو
اب بستر پر لیٹوں گا میں، لیٹتے ہی سو جاؤں گا

○

اُس گلی میں نہ جائیں گے ویسے
جائیں گے پھر اُسی گلی میں ہم

خودنمائی کے دن گئے اُٹھیے
ہیں بہت تیز روشنی میں ہم

نہیں معلوم آ گئے ہیں کہاں
چل پڑے تھے رواروی میں ہم

درمیانِ نزاعِ دیر و حرم
مارے جاتے ہیں کس خوشی میں ہم

ہم کہاں تا نشاطِ صبح گہی
لوٹ جائیں گے رات ہی میں ہم

یہ نہ مخفی رہے، دَمِ تحسین
گُھٹ رہے ہیں، نواگری میں ہم

خود کو برباد کر لیا ہے سو اب
محو ہیں اپنی دلدہی میں ہم

الغرض چین سے نہ بیٹھیں گے
اے خدا! تیری زندگی میں ہم

وہ کیا تغیرات کے سانچے میں ڈھل گئے
ہم بھی کچھ اور ہو گئے، ہم بھی بدل گئے

کس انجمن سے داد طلب ہوں وہ کم نصیب
جو شامِ نارسی کے اندھیروں میں جل گئے

ہے زادِ راہِ عشق اُنہی قافلوں کی یاد
جو زندگی کی دوڑ میں آگے نکل گئے

اے جانِ نغمگی! اُنہیں اب یاد بھی نہ کر
وہ راگ آگ ہو گئے، وہ ہونٹ جَل گئے

لفظِ وفا سے اب وہ تاثر نہ کر قبول
اِس عام فہم لفظ کے معنی بدل گئے

○

دید تھی انتظار کے مانند
وصل تھا ہجرِ یار کے مانند

ہم رمیدہ رہے غزالوں سے
آہوانِ تتار کے مانند

کر کے بسمل گیا ہے جو مجھ کو
ہے کٹیلا، کٹار کے مانند

اُس سے مِل کر سُدھارنا اپنا
تھی وہ حالت بخار کے مانند

اب میں اپنی تباہیوں کے بیچ
ہوں تری یادگار کے مانند

ہم تھے اے زُلف تیرے افشانگر
موجِ بادِ بہار کے مانند

مہلکے میں پڑی ہے جاں مری
اُس کا قامت ہے دار کے مانند

اے کفِ پا! یہ جی میں آتا ہے
تجھ میں چُبھ جاؤں، خار کے مانند

ٹکٹکی باندھ دیکھتا ہے مجھے
قیس اِک ہونہار کے مانند

بیٹھ جا راہ میں قرینے سے!
یاد آئی ہے، یار کے مانند

یاں اب اِک انتشار ہے درکار
زُلف کے انتشار کے مانند

سر بہ زانو ہے آسماں میں خدا
کسی بے اختیار کے مانند

○

کوچۂ یار! تیری خاک، دولتِ روزگار ہے
تجھ پہ جو ہو گئے نثار، اُن پہ جہاں نثار ہے

عشق کے زخمِ خونچکاں مشعلِ راہ بن گئے
پرتوِ زخمِ خوں چکاں، شمع سرِ مزار ہے

شہرِ وفا ترے شہید، شاہدِ شہرِ جاں بنے
شہر بہ شہر ذکر ہے، ناز ہے، افتخار ہے

عشق ترے ادا شناس، اپنی مثال آپ ہیں
جو بھی ہے، سر بلند ہے، جو بھی ہے خاکسار ہے

میری نگاہِ شوق سے تیری نگاہ جھک گئی
عشق نظر کی جیت ہے، حُسن نظر کی ہار ہے

اے صفِ زخم خوردگاں، دستۂ جاں سپردگاں
وقت ترا حصار ہے، وقت کا تُو حصار ہے

جانِ چمن رہو گے تم، غنچہ بہ غنچہ گُل بہ گُل
خوں شدگاں تمہارا خوں، نقش گرِ بہار ہے

شوقِ فزوں تری سبیل، خود ترے خوں کی سلسبیل
خود ترا بارِ امتحاں، راہ کا برگ و بار ہے

(۷)

دولتِ دہر سب لُٹائی ہے
میں نے دل کی کمائی کھائی ہے

ایک لمحے کو تیر کرنے میں
میں نے اِک زندگی گنوائی ہے

وہ جو سرمایۂ دل و جاں تھی
اب وہی آرزو پرائی ہے

تُو ہے آخر کہاں کہ آج مجھے
بے طرح اپنی یاد آئی ہے

جانِ جاں تجھ سے دُوبدو ہو کر
میں نے خود سے شکست کھائی ہے

عشق میرے گمان میں یاراں
دل کی اِک زور آزمائی ہے

اُس میں رہ کر بھی میں نہیں اُس میں
جانیے دل میں کیا سمائی ہے

موجِ بادِ صبا پہ ہو کے سوار
وہ شمیمِ خیال آئی ہے

شرم کر تُو کہ دشتِ حالت میں
تیری لیلیٰ نے خاک اُڑائی ہے

بِک نہیں پا رہا تھا سو میں نے
اپنی قیمت بہت بڑھائی ہے

وہ جو تھا جونؔ وہ کہیں بھی نہ تھا
حُسن اِک خواب کی جدائی ہے

○

فراق کیا ہے اگر، یادِ یار دل میں رہے
خزاں سے کچھ نہیں ہوتا، بہار دل میں رہے

گزار روز و شبِ وصل اِک نگار کے ساتھ
وہ ہے جو ایک شبِ انتظار دل میں رہے

تُو اپنی ذات کے باہر نہ بِکھریو زنہار
فضا کو صاف ہی رکھیو، غُبار دل میں رہے

نہ ہو اگر نہیں دیوار ہائے نقش و نگار
خیالِ پرتوِ نقش و نگار، دل میں رہے

رہی ہیں جس سے گزرنے کی حسرتیں کیا کچھ
گزارنا ہے تو وہ رہگزار، دل میں رہے

لبوں کا یہ ہے کہ رشتہ سبھی سے ہے اُن کا
بنے نہ جس سے لبوں کی، وہ خار دل میں رہے

تُو بیچ دے سرِ بازارِ ہوش دل اپنا
ہو اِک خیال جو دیوانہ وار دل میں رہے

○

دل کو اِک بات کہہ سنانی ہے
ساری دنیا فقط کہانی ہے

تُو مری جان داستاں تھا کبھی
اب ترا نام داستانی ہے

سہہ چکے زخمِ التفات ترا
اب تری یاد آزمانی ہے

اِک طرف دل ہے، اِک طرف دنیا
یہ کہانی بہت پرانی ہے

تھا سوال اُن اُداس آنکھوں کا
زندگی کیا نہیں گنوانی ہے

کیا بتاؤں میں اپنا پاسِ اَنا
میں نے ہنس ہنس کے ہار مانی ہے

ہوس انگیز ہے بدن تیرا
ہائے میری ہوس کہ فانی ہے

روزمرہ ہے زندگی کا عجیب
رات ہے اور نیند آنی ہے

زندگی کس طرح گزاروں میں
مجھ کو روزی نہیں کمانی ہے

زندگی کیا ہے' اِک کہانی ہے
یہ کہانی نہیں سُنانی ہے

ہے خدا بھی عجیب' یعنی جو
نہ زمینی' نہ آسمانی ہے

ہے مرے شوقِ وصل کو یہ گِلہ
اس کا پہلو' سرائے فانی ہے

اپنی تعمیرِ جان و دل کے لیے
اپنی بنیاد' ہم کو ڈھانی ہے

یہ ہے لمحوں کا ایک شہرِ ازل
یاں کی ہر بات ناگہانی ہے

چلیے اے جانِ شام آج تمہیں
شمع اِک قبر پر جلانی ہے

رنگ کی اپنی بات ہے ورنہ
آخرش خون بھی تو پانی ہے

اِک عبث کا وجود ہے جس سے
زندگی کو مُراد پانی ہے

شام ہے اور صحن میں دل کے
اِک عجب حُزنِ آسمانی ہے

شہر یہ دوسروں کا تھا، جس میں ہمیں سہا گیا
آج یہ بات سوچ کر، دل سے ہر اِک گِلہ گیا

دل یہ عجیب بات ہے تیری نہیں سُنی گئی
تھے جو بَلا کے سنگدل، اُن کا کہا سُنا گیا

ہاں! تری آرزوئے ناز ہم کو بہت عزیز تھی
پر ترے کوئے ناز میں، ہم سے نہیں رہا گیا

ہارسنگھار ہے اُداس اور وہ یوں کہ اِک پرند
چھوڑ کے اپنا آشیاں، جانے کہاں چلا گیا

اس کا حساب حشر تک، کون لگائے گا بھلا
تجھ سے گیا تو کیا گیا، مجھ سے گیا تو کیا گیا

بات یہ ہے کہ میں جو تھا، خود سے نہیں تھا باوفا
اس لیے اپنے آپ میں، مجھ سے نہیں رہا گیا

دل کا ہماری ذات سے اور برونِ ذات سے
جونؔ عجب تھا سلسلہ، ہائے وہ سلسلہ گیا

○

نکہتِ بادِ بہاری جا چکی
خسروِ گُل کی سواری جا چکی

اے متاعِ روزگارِ عاشقاں
عشق کی بازی تو ہاری جا چکی

اے زمیں! مژدہ کہ انجیلِ وفا
آسمانوں سے اُتاری جا چکی

اب نہیں دل میں وہ سوزِ انتظار
زندگی شاید گزاری جا چکی

شانۂ دل بھی شکستہ ہو چکا
زُلفِ جاناں بھی سنواری جا چکی

○

ابھی اِک شور سا اُٹھا ہے کہیں
کوئی خاموش ہو گیا ہے کہیں

ہے کچھ ایسا کہ جیسے یہ سب کچھ
اِس سے پہلے بھی ہو چکا ہے کہیں

تجھ کو کیا ہو گیا ہے کہ چیزوں کو
کہیں رکھتا ہے، ڈھونڈتا ہے کہیں

جو یہاں سے کہیں نہ جاتا تھا
وہ یہاں سے چلا گیا ہے کہیں

آج شمشان کی سی بُو ہے یہاں
کیا کوئی جسم جَل رہا ہے کہیں

ہم کسی کے نہیں جہاں کے سِوا
ایسی وہ خاص بات کیا ہے کہیں

تُو مجھے ڈھونڈ، میں تجھے ڈھونڈوں
کوئی ہم میں سے رہ گیا ہے کہیں

کتنی وحشت ہے درمیانِ ہجوم
جس کو دیکھو، گیا ہوا ہے کہیں

میں تو اب شہر میں کہیں بھی نہیں
کیا مرا نام بھی لِکھا ہے کہیں

اسی کمرے سے کوئی ہو کے وداع
اسی کمرے میں چُھپ گیا ہے کہیں

مِل کے ہر شخص سے ہوا محسوس
مجھ سے یہ شخص مِل چکا ہے کہیں

○

اُس کی گلگشت رہ گئی ٹل کے
پھول مرجھا گئے ہیں جنگل کے

دشت میں یہ خبر ہے گرم میاں
لوگ دریا سے آئے ہیں جَل کے

بند تکمہ قبائے خواب کا تھا
دل تو بس ہاتھ رہ گیا مَل کے

ایک طوفان ہم بپا کر دیں
ناف پیالہ ترا اگر چھلکے

اہلِ دل ہوں کہ اہلِ دانش ہوں
ہیں سبھی اپنی اپنی اٹکل کے

بات تُو کیجیو نہ ذرّوں کی
ان سے تو ہیں پہاڑ بھی ہلکے

کوچ اس کی لچک سے ہم نے کیا
ہم نہ تھے اس کمر کے اِک بَل کے

اِک گمانِ گزشت ہیں ہم جی
اور ہزاروں کھرب ہیں اِک پَل کے

دل گلی میں ہے اِک عجب ہلچل
نہیں پہنچا میں خود تلک چل کے

آج کے تھے معاملے کیا کیا
جانے کیا ہوں معاملے کل کے

وہ نہ قابو میں آ سکا صاحب
ورنہ ہم تو غضب تھے کَس بَل کے

میں جو بیٹا ہوں اِک فرنگن کا
جوَن سنولا گیا ہوں جَل جَل کے

○

دستِ تہی سے معرکۂ حال سر کیا
ہر در سے ہم نے دست فشاناں گزر گیا

مقسوم میں قدم کے مسافت تھی بے حساب
پس ہم نے شہر و دشت سے بیروں سفر کیا

خلوت سوال کرتی ہے سینے کا اِک خلا
بے خلوتی کو ہم نے ترے نام پر کیا

جامے میں جان کیسے پڑی اِک عجب میں ہوں
کیوں لفظ نے بہ صورتِ معنی اثر کیا

تھا اس سے نیم گام جُدائی کا فاصلہ
ہم نے اُسی میں خود کو بسر عمر بھر کیا

سیلِ شعور میں تھا کہاں بےخودی کا ہوش
جو ہم نے جان کر نہ کیا' جان کر کیا

اُن حالتوں کی یاد ترا حال خوش کہ جب
وہ شرمِ کیفیت میں رہا' ہم نے شر کیا

○

وہ کہاں، جس کی شکل دیکھوں میں
دل ہے خوں، اِس کی شکل دیکھوں میں

نہیں دیکھی ہے شکل تک اُس کی
خواب میں کس کی شکل دیکھوں میں

زنگ خوردہ ہے آئینہ' سو چلو
کسی مُفلس کی شکل دیکھوں میں

ہاں مجھے اور کام ہی کیا ہے
یوں ہی جس تِس کی شکل دیکھوں میں

جب وہ مجلس نشیں نہیں تو بھلا
اہلِ مجلس کی شکل دیکھوں میں

تم بھی جاناں کوئی نہیں ہو، میں بھی کوئی نہیں
یہ جو سخن ہے میرا، میری ہرزہ گوئی نہیں

خوابوں کی تو بات دگر ہے، خواب گہِ دل میں
ایسی بھی کچھ آنکھیں تھیں، جو پل بھر سوئی نہیں

ملکوں ملکوں پھر کر میں نے ایک ہی سچ پایا
سب کچھ ہے دنیا میں لیکن، بس دل جوئی نہیں

مجھ کو متاعِ غم اپنی کو خرچ نہ کرنا تھا
تڑپیں لہو میں میری آنکھیں، لیکن روئی نہیں

سبز تمناؤں سے جس کی سب کچھ تھا سرشار
فصلِ اُمید اُس پاگل دل نے، اب تک بوئی نہیں

نہ میرے لیے حُسن میں اب کشش ہے، نہ کچھ کیف ہے، رندی و سرخوشی میں
یہ کیا ہو گیا میری دیوانگی کو، یہ کیا انقلاب آ گیا زندگی میں

میں کب سے کڑی دھوپ میں چل رہا ہوں، نہ گیسو کا سایہ، نہ آنچل کی چھاؤں
کبھی کتنی ہی شبنمی خلوتیں تھیں، مرے جادۂ شوق و آشفتگی میں

بُھلا دو جنوں کے وہ سارے فسانے، وہ اپنا ترنم وہ میرے ترانے
جنوں کے لیے کچھ رعایت نہیں ہے، نئے عہد کی سنگ دل آگہی میں

بہت بے وفا ہیں وفا کرنے والے، یہ تم کِن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہو
کِسے فرصتِ کاروبارِ وفا ہے، کِسے دل کا احساس ہے بے حسی میں

ہمیشہ سے پرویز و شیریں کا رشتہ ہے زرّیں حکایت، کھنکتی حقیقت
یہ رشتہ ہے زنجیرِ تعزیرِ محنت، کھپاؤ نہ سر مُزدِ تیشہ زنی میں

اگر اب نہیں تو بہت جلد تم کو، بُھلانے پہ مجبور کر دے گی دنیا
وہ سب عہد و پیماں جو تم نے کیے تھے، تصور کی مہکی ہوئی چاندنی میں

تمہارے مغنی نے لب سی لیے ہیں، کہ انفاس پر آ گئی تھیں خراشیں
بھلا کیوں کوئی اپنا سینہ دُکھائے، ہوں جذبات جب عالمِ جانکنی میں

مرے عہدِ ماضی کی سرشار صبحو! غمِ دل کے زنداں سے باہر نہ آؤ
اندھیروں کا طوفاں ڈبو دے گا تم کو، دوبارہ غمِ یاس کی تیرگی میں

○

جب سے میں اپنے آپ میں آیا، نیند گئی آرام گیا
یادوں نے وہ شور مچایا، نیند گئی آرام گیا

میں ہوں اور میں ایک نہیں ہوں، اپنی شبِ تنہائی میں
مجھ سے میرا میں ٹکرایا، نیند گئی آرام گیا

نیند میری پلکوں پر جاگی، چشم براہ آرام کی تھی
منتظری میں وقت گنوایا، نیند گئی آرام گیا

جاناں! دونوں ایک ہیں شاید، وعدہ خلافی اور وعدہ
تیرے وعدے نے تڑپایا، نیند گئی آرام گیا

سائے ہیں یا سانسوں کے سایوں کا پرتوِ آشوب
ہے آشوب کناں ہر سایہ، نیند گئی آرام گیا

اپنا دُکھ ہو تو ہم اس کو اپنے ڈھب پر لے آئیں
اپنا تو دُکھ بھی ہے پرایا، نیند گئی آرام گیا

سینے میں کہرام پڑا ہے، ہونٹوں نے چُپ سادھی ہے
شور خموشی میں بھر پایا، نیند گئی آرام گیا

جب کچھ کچھ آرام آیا اور نیند بھی آنے والی تھی
بس پھر کیا تھا، میں چلّایا، نیند گئی آرام گیا

○

عرق عرق مری بانہوں میں اُس نگار کو دیکھ
بہار! تُو مرے یارِ بدن بہار کو دیکھ

وہی ہے سوزِ فراق از وصال تا بہ وصال
نہ بُجھ سکے گی مری پیاس، میرے پیار کو دیکھ

ورودِ قاصدِ گلگوں قبائے جاناں سے
جو اَب کے دشت میں آئی ہے، اُس بہار کو دیکھ

ہے رنگِ حیلۂ پرویز اُڑا ہوا اب کے
شکوہِ تیشہ بدوشانِ تازہ کار کو دیکھ

خدا کو حق کے مقابل میں کھینچ لائے ہیں
ذرا زوالِ خدایانِ روزگار کو دیکھ

دمک اُٹھے وہ کنائے، چمک اُٹھے سائے
فروغِ شعلہ فشانانِ حرفِ دار کو دیکھ

ہے دستہ دستہ عجب شورِ رقص و جامہ دری
نشاطِ کوکبۂ رہ گزارِ یار کو دیکھ

ترانہ خواں ہیں کبھی اور گِلہ کناں ہیں کبھی
گروہِ لحظہ شمارانِ انتظار کو دیکھ

○

پُرامیدی بحال مت کیجو
تُو ہمارا خیال مت کیجو

ایک پَل ہے کہ ہے ہمیشہ سے
گِلۂ ماہ و سال مت کیجو

جان ہی چاہے دل کو دھوکا دے
کچھ بھی ہو، تُو ملال مت کیجو

تُو خیالوں کو اور خوابوں کو
اپنے حق میں وبال مت کیجو

یہ دیارِ زوال ہے سو یہاں
جونؔ کوئی کمال مت کیجو

میرے دل تجھ سے عرض ہے میری
مجھ سے تُو کوئی چال مت کیجو

جب تلک زخم ہیں، سو رنگ بھی ہے
ہوسِ اندمال مت کیجو

رات بابا الف نے فرمایا
یاں کوئی بھی سوال مت کیجو

لال ہیں اس کے ہونٹ اور کتنے
تُو اُنہیں اور لال مت کیجو

○

شکوہ اوّل تو بے حساب کیا
اور پھر بند ہی یہ باب کیا

جانتے تھے بدی عوام جسے
ہم نے اُس سے بھی اجتناب کیا

تھی کسی شخص کی تلاش مجھے
میں نے خود کو ہی انتخاب کیا

اِک طرف میں ہوں، اِک طرف تم ہو
جانے کِس نے کِسے خراب کیا

آخر اب کس کی بات مانوں میں
جو مِلا، اُس نے لاجواب کیا

یوں سمجھ تجھ کو مضطرب پا کر
میں نے اظہارِ اضطراب کیا

کبھی آ وَ نازِ نازاں، سوئے بزمِ بے نیازاں
کہ سکھائیں کچھ ادائیں، تمہیں یہ ادا نوازاں

نفسِ شمیم! تیری ہوسِ سحر گہی سے
ہیں شکن شکن پریشاں، مرے گیسوئے درازاں

ہے مری خزاں سے نرخِ ہوسِ بہار بالا
ہیں مرے بدن بہاراں، مری اس خزاں پہ نازاں

مرا سُرخ فام سرخوش اُنہیں یاد کر رہا ہے
رہے سرنگوں جو یاراں، ہیں کہاں وہ سرفرازاں

جو بدن پہ کِھل رہا ہو، وہی چاہیے بدن کو
مرے زخم تیرے زیور، ہیں سبھی زمانہ سازاں

ہے سکوتِ بیکرانہ، جو نہ تیرہ ہے نہ روشن
ابھی وا نہیں ہوئے ہیں لبِ کہکشاں گدازاں

○

بستیوں پر ہے کوہکن تنہا
کیا خوش آیا ہے کارِ فن تنہا

بے مثالی پہ خوش نہ ہو یعنی
رہ گیا تیرا بانکپن تنہا

سُن رہے ہو تمہارے اُٹھتے ہی
ہو گئی ساری انجمن تنہا

جب سے تھک کر گرے ہیں ہم تب سے
ہیں غزالاں، ختن ختن تنہا

شہر لے جا رہے ہیں مجنوں کو
آج سے ہو رہا ہے بَن تنہا

○

جو بھی ہے، یادگار ہے، آخرِ شب ہے دوستاں
ہے شبِ آخرِ بہار، آخرِ شب ہے دوستاں

اب نہ کرو یہ تذکرہ، کس سے کسے گِلے رہے
سب کو تھا سب پہ اعتبار، آخرِ شب ہے دوستاں

رنگِ فسونِ مے بھی ہے، لہر ہے اور لے بھی ہے
ہیں دل و دیدہ سوگوار، آخرِ شب ہے دوستاں

وقتِ وداع آ گیا، آؤ یہ بات جان لیں
کون تھا کس کا جاں نثار، آخرِ شب ہے دوستاں

لَب سے ہوا ہے شعلہ وار نعرۂ ہاؤ ہُو بلند
رقص ہوا ہے شعلہ وار، آخرِ شب ہے دوستاں

○

تھے عجب دن ہماری حالت کے
ہم تھے اِک پیشہ ور شکایت کے

خود ہی وہ آ گیا تھا دل کے قریب
ہم ہیں مارے ہوئے سہولت کے

نشہ چڑھنے لگا اُداسی ...... کا
پھول مہکے ہیں شامِ فرقت کے

دِل میں اِک آگ ہے سو ہے لیکن
کوئی معنی نہیں محبت کے

سب کرو اپنے اپنے کام کہ میں
دُکھ اُٹھاتا ہوں اپنی فرصت کے

آسمانِ خموشیِ .... جاوید
نہیں زمیں پر یہ دن قیامت کے

وہ بدن تھا غضب ہوس انگیز
تھے وہ شہوت کے دن شہادت کے

ہم ہیں اِک طائفہ غلاموں کا
سو وفادار ہیں حکومت کے

○

یاں ہیں سب اپنی اپنی حالت کے
شہر آباد دل کی وحشت کے

اے خوشا حال جب کہ تھے معنی
حالتِ حالِ بے نہایت کے

حرم و دیر کی سیاست ہے
اور سب فیصلے ہیں نفرت کے

یار کل صبح آئے ہم کو نظر
آدمی کچھ عجیب صورت کے

ان دنوں حال شہر کا ہے عجیب
لوگ مارے ہوئے ہیں دہشت کے

جشن اِک بے ضرورتی کا ہے
ہم نہیں ہیں کسی ضرورت کے

اب کہاں وہ ترا پیالۂ ناف
ہائے یہ دن نشے کی ہجرت کے

یعنی جو کچھ ہے اِک تماشا ہے
یعنی سب کھیل ہیں مشیّت کے

میں ہوا نوش ہوں سرابوں کا
عیش ہیں تشنگی کی لذت کے

○

نہیں جذبے کسی بھی قیمت کے
ہم ہیں حیران اپنی حیرت کے

اس میں آخر عجب کی بات ہے کیا
تم نہیں تھے مری طبیعت کے

پُوچھ مت بے شکایتی کا عذاب
کیا عجب عیش تھے شکایت کے

یہ جو آنسو ہیں، رخصتی آنسو
یہ عطیے ہیں دل کی عادت کے

ہم ہی شیعوں کے مجتہد ہیں مغاں!
ہم ہی مُفتی ہیں اہلسنّت کے

ہم تو بس خون تھوکتے ہیں میاں
نہیں خوگر کسی مشقت کے

یہ جو لمحے وصال کے ہیں میاں
ہیں یہ لمحے تمام ہجرت کے

جونؔ، یزدان و آدم و ابلیس
ہیں عجب معجزے حکایت کے

(۱)

بزم سے جب نِگار اُٹھتا ہے
میرے دل سے غُبار اُٹھتا ہے

میں جو بیٹھا ہوں تو وہ خوش قامت
دیکھ لو! بار بار اُٹھتا ہے

تیری صورت کو دیکھ کر مری جان
خودبخود دل میں پیار اُٹھتا ہے

اُس کی گُل گشت سے روش بہ روش
رنگ ہی رنگ یار اُٹھتا ہے

تیرے جاتے ہی اِس خرابے سے
شورِ گریہ ہزار اُٹھتا ہے

کون ہے جس کو جاں عزیز نہیں؟
لے ترا جاں نثار اُٹھتا ہے

صف بہ صف آ کھڑے ہوئے ہیں غزال
دشت سے خاکسار اُٹھتا ہے

ہے یہ تیشہ کہ ایک شعلہ سا
بر سرِ کوہسار اُٹھتا ہے

کربِ تنہائی ہے وہ شے کہ خدا
آدمی کو پکار اُٹھتا ہے

تُو نے پھر کسبِ زر کا ذکر کیا
کہیں ہم سے یہ بار اُٹھتا ہے

لو وہ مجبورِ شہر صحرا سے
آج دیوانہ وار اُٹھتا ہے

اپنے ہاں تو زمانے والوں کا
روز ہی اعتبار اُٹھتا ہے

جونؔ اُٹھتا ہے، یوں کہو، یعنی
میرؔ و غالبؔ کا یار اُٹھتا ہے

○

مت پوچھو کتنا غمگیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی
میں جو تھا اب میں وہ نہیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی

میں جو بگولا بن کے بکھرا وقت کی پاگل آندھی میں
کیا میں تمہاری لہر نہیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی

یوں تو سمندر ہے دو قدم پر جا ڈوبوں، پر میں تو یہاں
ایک قدم بے سطحِ زمیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی

بان ندی کے پاس امروہے میں جو لڑکا رہتا تھا
اب وہ کہاں ہے؟ میں تو وہیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی

○

تھی گزشت اُن کی عجیب ہی، وہ جو جان سے تھے گزر گئے
ہے تمام شہر تحیری، جو تری گلی کے تھے، گھر گئے

شب و روز کا ہے معاملہ، نہ کوئی صِلہ نہ کوئی گِلہ
وہ معاملہ دل و جاں کا تھا، کبھی جی اُٹھے، کبھی مر گئے

تمہیں اپنا حال سُنائیں کیا، تمہیں رمز کوئی بتائیں کیا
وہ چلا گیا تو چلا گیا، وہ جو آ گیا تو سنور گئے

نہیں مجھ میں اب کوئی دلبری کہ نفس نفس ہے ستم گری
مرے سارے رنگ اُتر گئے، مرے سارے خواب بکھر گئے

کسی خواب کا ہو خیال کیا، کوئی خواب بھی نہیں درمیاں
کسی رنگ پر کریں کیا نظر، کہ مژہ تو خون میں بھر گئے

یہ کہن شتاب نہیں ہے کیا، یہ سخن عذاب نہیں ہے کیا
وہی رہگزار ہے بے قدم، اسی رہگزار میں سر گئے

وہ خیال کا تھا سماں کوئی، وہ گماں کا تھا گماں کوئی
تھی عجیب حالتِ حالِ دل، سو ہم اپنے آپ سے ڈر گئے

مجھے چھوڑ کر جو چلے گئے، سرِ راہِ زردِ حلالِ جاں
وہ تمام لوگ کہاں کے تھے، وہ تمام لوگ کدھر گئے

کبھی جشنِ غم بھی منائیں ہم، کریں رقص اور کبھی گائیں ہم
وہ تمہارے شام و سحر گئے، وہ ہمارے شام و سحر گئے

○

نہ دیر و زود، نہ بُود و نبُود کا آشوب
یہ شامِ ہرزہ خرامی ہے کیا بلا آشوب

مُرادمند حضوری میں سینہ کوب، یہ کیا؟
وہی جنونِ دل آشوب، دِلربا آشوب

یہ کوئی صومعہ دارانِ شہر سے کہہ دو
ہے آج مست وہ آہوے صوفیا آشوب

صفا کو جس کی صبا سے ضرر، نگہ سے زیاں
عجب وہ قامتِ کافر ہے مدعا آشوب

وہ یارِ خلوتِ جاں ہے وفا طلب ہر آن
جمالِ راہگزر ہے کہ ہے وفا آشوب

مزاجِ شام ہے بیعت طلب مدینے سے
ہوا ہے تازہ پھر اِسلام کربلا آشوب

خوشا کہ ہے صنمِ سُرخ مستِ جلوہ گری
وہی صنم کہ ہے یارانِ من خدا آشوب

○

مسندِ غم پہ جچ رہا ہوں میں
اپنا سینہ کُھرچ رہا ہوں میں

اے سگانِ گرسنۂ ایام
جوں غذا تم کو پچ رہا ہوں میں

اندرونِ حصارِ خاموشی
شور کی طرح مچ رہا ہوں میں

وقت کا خونِ رائیگاں ہوں مگر
خشک لمحوں میں رَچ رہا ہوں میں

خون میں تر بتر رہا مرا نام
ہر زمانے کا سچ رہا ہوں میں

حال یہ ہے کہ اپنی حالت پر
غور کرنے سے بچ رہا ہوں میں

لُطفِ دیدارِ آخری بھی سہی
آخری بار یہ خوشی بھی سہی

ہے بدن سوز بادِ نیم شبی
ایسے عالم میں چاندنی بھی سہی

کربِ معمول کے مطابق ہے
خواہشِ طولِ زندگی بھی سہی

ازرہِ دلدہی مرے غم میں
مجھ سے دعوائے ہمسری بھی سہی

کتنا گہرا تھا ربطِ شوق کبھی
اب یہی ربط سرسری بھی سہی

کسی عنوان وقت گزرے تو
وقت گزرے تو جانکنی بھی سہی

جب نسیمِ سحری آتی ہے
ہم کو یاد ایک گلی آتی ہے

زہر اچھا ہے کہ اس کو پی کر
لذتِ تشنہ لبی آتی ہے

جاؤ بھی میں نے تمہیں دیکھ لیا!
تم سے بس دل شکنی آتی ہے

عشقِ آزاد کی آزادی میں
کامیابی سے کمی آتی ہے

جانیے کون بُلاتا ہے مجھے
ایک آواز چلی آتی ہے

کیوں رہے زُلف پر احسانِ نسیم
ہم سے جب شانہ کشی آتی ہے

آپ جو چارہ گری کرتے ہیں
آپ سے چارہ گری آتی ہے؟

میرے غصّے کا اثر کیا ہو گا
مجھ کو غصّے میں ہنسی آتی ہے

بُت گری کرتے رہے ہیں احباب
جونؔ سے بُت شکنی آتی ہے

(۱)

نشۂ ماہ و سال ہے، تاحال
شوق اُس کا کمال ہے، تاحال

نکہتِ گُل اِدھر نہ آئیو تُو
جی ہمارا نڈھال ہے، تاحال

میرا سینہ چِھلا ہوا ہے مگر
شوقِ بحث و جدال ہے، تاحال

اس عبث خانۂ حوادث میں
ہر جواب اِک سوال ہے، تاحال

بڑھ رہا ہوں زوال کی جانب
دل میں زخمِ کمال ہے، تاحال

کب کا تاراج ہو چکا ہوں مگر
ذہن میں اِک مثال ہے، تاحال

زخمِ کاری کے باوجود مجھے
ہوسِ اندمال ہے، تاحال

دامنِ آلودگی کے بعد بھی تُو
آپ اپنی مثال ہے، تاحال

ہے یہ صورت کہ اشتیاق اُس کا
بے اُمیدِ وصال ہے، تاحال

تھا جو شکوہ سو ہے وہ تا ایں دم
وہ جو تھا اِک ملال ہے، تاحال

زندگی ہے لہولہان مگر
رنگ بے خدّوخال ہے، تاحال

ہے سوادِ ختن غزل میری
تُو غزل کا غزال ہے، تاحال

لالہ رُویا، شکن شکن مُویا
تجھ کو پانا محال ہے، تاحال

کتنے چارہ گروں نے زحمت کی
پر وہی میرا حال ہے، تاحال

○

بیمار پڑوں تو پوچھیو مت
دل خوں بھی کروں تو پوچھیو مت

میں شدتِ غم سے حال اپنا
کہہ بھی نہ سکوں تو پوچھیو مت

ڈر ہے کہ مجھے جنوں نہ ہو جائے
ہو جائے جنوں تو پوچھیو مت

میں شدتِ غم سے عاجز آ کر
ہنسنے بھی لگوں تو پوچھیو مت

آتے ہی تمہارے پاس اگر میں
جانے بھی لگوں تو پوچھیو مت

○

اِک زخم بھی یارانِ بسمل نہیں آنے کا
مقتل میں پڑے رہیے، قاتل نہیں آنے کا

اب کوچ کرو یارو صحرا سے کہ سنتے ہیں
صحرا میں اب آئندہ محمل نہیں آنے کا

واعظ کو خرابے میں اِک دعوتِ حق دی تھی
میں جان رہا تھا، وہ جاہل نہیں آنے کا

بنیادِ جہاں پہلے جو تھی وہی اب بھی ہے
یوں حشر تو یارانِ یک دل نہیں آنے کا

بُت ہے کہ خدا ہے وہ' مانا ہے نہ مانوں گا
اُس شوخ سے جب تک میں خود دل نہیں آنے کا

گر دل کی یہ محفل ہے' خرچا بھی ہو پھر دل کا
باہر سے تو سامانِ محفل نہیں آنے کا

وہ ناف پیالے سے سرمست کرے ورنہ
ہو کے میں کبھی اُس کا قائل نہیں آنے کا

وحشت کو سوا نہ کیجیو اب
تم ذکرِ وفا نہ کیجیو اب

ملتے ہیں کہ شہر میں ہیں لیکن
ملنے کی دُعا نہ کیجیو اب

کیا شے ہے وفا کی استواری؟
اِس بات کو وا نہ کیجیو اب

بے لذتِ دید ہے نظارہ
تم مشقِ ادا نہ کیجیو اب

ہم سے نہ اُٹھے گا بارِ ایثار
غم ہو تو ہنسا نہ کیجیو اب

کہنے سے مری مراد یہ ہے
تم میرا کہا نہ کیجیو اب

ہے وصل سے جبر ہی تو منظور
اظہارِ رضا نہ کیجیو اب

مجھ کو بیگانہ کر گئے مرے دن
مجھ سے ہو کر گزر گئے مرے دن

اب نہ کوئی دن مرے گھر جائے گا
جانیے کِس کے گھر گئے مرے دن

اب نہیں ہیں مرے کوئی دن رات
کہ مجھ ہی کو بسر گئے مرے دن

ساری راتیں گئیں مری بے حال
میرے دن! بے اثر گئے مرے دن

میرے مژگاں کو رنگ کی تھی ہوس
خون میں تر بہ تر گئے مرے دن

خوشا اب انتظار ہے نہ اُمید
یارِ یاراں ! سُدھر گئے مرے دن

اب میں بس رہ گیا ہوں راتوں کا
مر گئے جونؔ! مر گئے مرے دن

لمحے لمحے کی نارسائی ہے
زندگی حالتِ جدائی ہے

مردِ میداں ہوں اپنی ذات کا میں
میں نے سب سے شکست کھائی ہے

اِک عجب حال ہے کہ اب اس کو
یاد کرنا بھی بے وفائی ہے

اب یہ صورت ہے جانِ جاں کہ تجھے
بُھولنے میں مری بھلائی ہے

خود کو بُھولا ہوں، اُس کو بھولا ہوں
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

میں ہنرمندِ رنگ ہوں میں نے
خون تھوکا ہے داد پائی ہے

جانے یہ تیرے وصل کے ہنگام
تیری فرقت کہاں سے آئی ہے

○

ناروا ہے سخن شکایت کا
وہ نہیں تھا مِری طبیعت کا

دشت میں شہر ہو گئے آباد
اب زمانہ نہیں ہے وحشت کا

وقت ہے اور کوئی کام نہیں
بس مزہ لے رہا ہوں فرصت کا

میں اگر تذکرہ کروں تو کروں
کِس کی زُلفوں کا، کِس کی قامت کا

مر گئے خواب سب کی آنکھوں کے
ہر طرف ہے گِلہ حقیقت کا

اب مجھے دھیان ہی نہیں آتا
اپنے ہونے کا، اپنی حالت کا

تجھ کو پا کر زیاں ہوا ہم کو
تُو نہیں تھا ہماری قیمت کا

صبح سے شام تک مری دُنیا
ایک منظر ہے اُس کی رُخصت کا

کیا بتاؤں کہ زندگی کیا تھی
خواب تھی جاگنے کی حالت کا

کہتے ہیں انتہائے عشق جسے
اِک فقط کھیل ہے مروّت کا

آ گئی درمیان روح کی بات
ذکر تھا جسم کی ضرورت کا

تھوک کر خون رنگ میں رہنا
میں ہنرمند ہوں اذیت کا

زندگی کی غزل تمام ہوئی
قافیہ رہ گیا محبت کا

○

سلسلۂ جنباں شام ہے کس کی، شکوہ کناں ہے کس کی شام
ہم تو گماں بر باد ہی ٹھہرے، شامِ گماں ہے کس کی شام

اس میدانِ شکستِ جاں میں کون بچا زندہ جانے
کیا جانے اس شہرِ عبث میں کس کا زیاں ہے کس کی شام

آج کہاں کیسا موسم ہے جسم و جاں کی بستی میں
شبنم شبنم جسم ہے کس کا، شعلہ بجاں ہے کس کی شام

شام کا شہرِ ناپُرساں ہے اور بازاروں کا آشوب
پرسشِ جاں، تیرے قریے میں فرحتِ جاں ہے کس کی شام

گُم ہوئی اپنی خوش گزرانی کوچۂ دل ناپُرساں میں
کوچۂ دل پرساں میں نہ جانے، خوش گزراں ہے کس کی شام

○

گہے وصال تھا جس سے تو گاہ فرقت تھی
وہ کوئی شخص نہیں تھا، وہ ایک حالت تھی

وہ بات جس کا گِلہ تک نہیں مجھے، پر ہے
کہ میری چاہ نہیں تھی، مری ضرورت تھی

وہ بیدلی کی ہوائیں چلیں کہ بھول گئے
کہ دل کے کون سے موسم کی کیا روایت تھی

نہ اعتبار، نہ وعدہ، بس ایک رشتۂ دید
میں اُس سے رُوٹھ گیا تھا، عجیب ہمت تھی

گمانِ شوق، وہ محمل نظر نہیں آتا
کنارِ دشت وہی تو بس اِک عمارت تھی

حسابِ عشق میں آتا بھی کس حسین کا نام
کہ ہر کسی میں کسی اور کی شباہت تھی

ہے اُس سے جنگ اب ایسی کہ سامنا نہ کریں
کبھی اُسی سے کمک مانگنے کی عادت تھی

○

جانِ نگاہ و روحِ تمنا چلی گئی
اے نجدِ آرزو! مری لیلیٰ چلی گئی

رخصت ہوئی دیار سے اِک نازشِ دیار
صحرا سے اِک غزالۂ صحرا چلی گئی

برباد ہو گئی مری دنیائے جستجو
دنیائے جستجو، مری دُنیا چلی گئی

زہرہ مرا ستارۂ قسمت خراب ہے
ناہید! آج میری ثریا چلی گئی

کس سے کہوں کہ ایک سراپا وفا مجھے
تنہائیوں میں چھوڑ کے تنہا چلی گئی

نورِ جہانِ شعر نے سب کچھ بھلا دیا
زیب النسائے نظمِ معلیٰ چلی گئی

مجھ کو ملامتوں کے جہنم میں چھوڑ کر
اِک خُلدِ عہد و جنتِ ایفا چلی گئی

اب انتظارِ عشرتِ فردا نہیں رہا
اُمید گاہِ عشرتِ فردا چلی گئی

کیسے کہوں کہ وہ غمِ اُلفت فریب تھا
کیسے یقیں کروں کہ زلیخا چلی گئی

اے بزمِ دخترانِ قبیلہ! یہ کیا ہوا؟
وہ جانِ دلبرانِ قبیلہ چلی گئی

فرہاد سُن لیا! تری شیریں کہاں ہے آج
وامق! خبر بھی ہے، تری عذرا چلی گئی

اس انجمن سے رقصِ تماشا طلب نہ کر
جس انجمن کی انجمن آرا چلی گئی

ہم شہیدِ خیال بے چارے
گئے رانوں کے درمیاں مارے

سخن آتا ہے اُس نفس لب پر
جب زباں بولتی ہو انگارے

صد ازل او صد ابد یاراں
ہم نے یونہی سے سانس پر وارے

اپنے قاتل پہ رحم آتا ہے
ہم گئے اپنے ہاتھ سے مارے

جان کچھ جیت میں نہیں رکھا
کوئی ہارے تو کس لیے ہارے

لمحے کو بے وفا سمجھ لیجے
جاودانی ادا سمجھ لیجے

میری خاموشیٔ مسلسل کو
اِک مسلسل گِلہ سمجھ لیجے

آپ سے میں نے جو کبھی نہ کہا
اُس کو میرا کہا سمجھ لیجے

جس گلی میں بھی آپ رہتے ہوں
واں مجھے جا بہ جا سمجھ لیجے

آپ آجایئے قریب مرے
مجھ کو مجھ سے جُدا سمجھ لیجے

جو نہ پہنچائے آپ تک مجھ کو
آپ اُسے واسطہ سمجھ لیجے

نہیں جب کوئی مدعا میرا
کوئی تو مدعا سمجھ لیجے

جو کبھی حالِ حال میں نہ چلے
اس کو بادِ صبا سمجھ لیجے

جو کہیں بھی نہ ہو، کبھی بھی نہ ہو
آپ اُس کو خدا سمجھ لیجے

جو طے ہوئے تھے کبھی کیفِ بیخودی کے لیے
فغاں! کہ اب وہ مراحل ہیں آگہی کے لیے

ہوا تھا جس سے شعورِ شباب کا آغاز
ہے اب بھی میری محبت فقط اُسی کے لیے

اُتر چکی ہے مری روح میں کسی کی نگاہ
تڑپ رہی ہے مری زندگی کسی کے لیے

جنونِ عشق نے اپنا لہو نچوڑا ہے
بہارِ حُسن کی خودکام دلکشی کے لیے

فضائے نو! سحرِ نو سنوارنے والے
تڑپ رہے ہیں اندھیروں میں روشنی کے لیے

حرم کو اُن کی جبینوں پہ ناز ہے کیا کیا
جو بُت شکن بھی بنے ہیں تو بُت گری کے لیے

حریمِ عیش و مسرت کے ناز پروردہ
ستم! کہ ہیں مری ناکام زندگی کے لیے

کوئے خواہش میں خم بہ خم ٹھیروں
دَم نہ لوں اور دَم بہ دَم ٹھیروں

فرصتِ یک نفس نہیں ورنہ
میں تو خود میں قدم قدم ٹھیروں

دورِ مستی میں جام ٹھیرے تُو
میں جو ہوں، میری جاں! میں جم ٹھیروں

آرزو ہے کہ دشتِ وحشت میں
اے غزالہ! میں تیرا رَم ٹھیروں

میں ہوں ایک ایسی راہ میں کہ جہاں
نہ چلوں اور بہت ہی کم ٹھیروں

ساری دُنیا کے غم ہیں غم میرے
میں بھی آخر کسی کا غم ٹھیروں

اِک ہوس ہے کہ تیرے لب پر میں
اپنی ہی جان کی قسم ٹھیروں

صفحۂ ذات پر رقم ہو حیات
تُو دوات اور میں قلم ٹھیروں

○

ہم نہ کرنے کے کام کرتے ہیں
اور عجب طرح کر گزرتے ہیں

مار ڈالیں اسے یہ ہے مقصود
سو میاں جی ہم اس پہ مرتے ہیں

میں ہوں اس شہر میں مقیم جہاں
اپنے ہونے سے لوگ ڈرتے ہیں

رنگ ہی کیا ترے سنورنے کا
ہم لہو تھوک کر سنورتے ہیں

اپنے گنگ و جمن میں زہر تھا کیا؟
ہم سمندر کا دَم جو بھرتے ہیں

ناؤ سمجھیں بھنور کو جونؔ جو لوگ
بس وہی ڈُوب کر اُبھرتے ہیں

○

طعنوں کے وار اپنا اثر کر گئے ہیں کیا
اے بے لحاظ! زخمِ عبث بھر گئے ہیں کیا

اب شہرِ یار سے کوئی پُرسش نہ شور و شر
شوریدگانِ شہر سفر کر گئے ہیں کیا

اسرارِ جاں کا ذکر ہے بازاریوں میں عام
اہلِ حرم یہاں سے کُھلے سر گئے ہیں کیا

ہنگامہ شہر میں جو بپا کر کے آئے تھے
گھر آ کے اس سے آپ ہی ہم ڈر گئے ہیں کیا

تُو آستیں چڑھائے چلا ہے جو سوئے غیر
جاں دادگانِ تیغِ ادا مر گئے ہیں کیا

کچھ بھی کیا ہو ہم نے، کہیں بھی گئے ہوں ہم
حد سے تمہاری یاد کی باہر گئے ہیں کیا

○

اے وصل! کچھ یہاں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا
اُس جسم کی میں جاں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

تُو آج میرے گھر میں جو مہماں ہے، عید ہے
تُو گھر کا میزباں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

کھولی تو ہے زبان مگر اس کی کیا بساط
میں زہر کی دکاں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

کیا ایک کاروبار تھا وہ ربطِ جسم و جاں
کوئی بھی رائگاں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

کتنا جلا ہوا ہوں بس اب کیا بتاؤں میں
عالم دھواں دھواں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

دیکھا تھا جب کہ پہلے پہل اُس نے آئینہ
اس وقت میں وہاں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

وہ اِک جمال، جلوہ فشاں ہے زمیں زمیں
میں تا بہ آسماں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

میں نے بس اِک نگاہ میں طے کر لیا تجھے
تُو رنگِ بیکراں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

گُم ہو کے جان تُو مری آغوشِ ذات میں
بے نام و نشاں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

ہر کوئی درمیان ہے اے ماجرا فروش!
میں اپنے درمیاں نہ ہوا، کچھ نہیں ہوا

○

شب زدگاں بہم دگر، گریہ و گفتگو کرو
قصۂ سوزِ جاں کہو، پرسشِ آرزو کرو

نخوتیانِ شہر بھی، طعنہ زناں ہیں دُوبدُو
نخوتیانِ شہر پر، طعن بھی دُوبدُو کرو

مست ہیں خوابِ عیش میں، عشرتیانِ نوشِ خواب
جادہ بہ جادہ کُو بہ کُو، شہر میں ہاؤ ہُو کرو

نشۂ رنگ و بُو سے تم، مست ہوا پنے آپ میں
ہم کو بھی اپنا رنگ دو، ہم کو بھی مشکبو کرو

کیسا لحاظ کس کا پاس، ہے یہ دیارِ ناشناس
جو بھی ہے رُوبرُو کہو، جو بھی ہے رُوبرُو کرو

یہ ہے خرابۂ نبود، یعنی خرابۂ وجود
زہر نفس نفس پیو، نشہ سبُو سبُو کرو

ایزد و اہرمن تو ہیں، لمحہ بہ لمحہ کینہ جُو
بُود کی جیب میں ہے چاک، یار کوئی رفو کرو

پھینک دے اے حسینِ عصر! پھینک دے تیغ اور سپر
وقتِ نمازِ عصر ہے، خون سے تو وضو کرو

ڈھاؤ حرم کو بے تکان، آگ لگاؤ دیر میں
جونؔ یہ کام ہے ترا، جونؔ یہ کام تو کرو

(ع)

خواب کی حالتوں کے ساتھ، تیری حکایتوں میں ہیں
ہم بھی دیارِ اہلِ دل، تیری روایتوں میں ہیں

وہ جو تھے رشتہ ہائے جاں، ٹوٹ سکے بھلا کہاں
جاں! وہ رشتہ ہائے جاں، اب بھی شکایتوں میں ہیں

ایک غُبار ہے کہ ہے، دائرہ وار پُرفشاں
قافلہ ہائے کہکشاں، تنگ ہیں، وحشتوں میں ہیں

وقت کی درمیانیاں، کر گئیں جاں کنی کو جاں
وہ جو عداوتیں کہ تھیں، آج محبتوں میں ہیں

پرتوِ رنگ ہے کہ ہے، دید میں جانشینِ رنگ
رنگ کہاں ہیں رُونما، رنگ تک نکہتوں میں ہیں

ہے یہ وجود کی نمود، اپنی نفس نفس گریز
وقت کی ساری بستیاں، اپنی ہزیمتوں میں ہیں

گرد کا سارا خانماں، ہے سرِ دشت بے اماں
شہر ہیں وہ جو ہر طرح، گرد کی خدمتوں میں ہیں

وہ دل و جان صورتیں، جیسے کبھی نہ تھیں کہیں
ہم اُنھیں صورتوں کے ہیں، ہم اُنھیں صورتوں میں ہیں

میں نہ سنوں گا ماجرا، معرکہ ہائے شوق کا
خون گئے ہیں رائیگاں، رنگ ندامتوں میں ہیں

رُوٹھا تھا تجھ سے یعنی خود اپنی خوشی سے میں
پھر اس کے بعد جان نہ رُوٹھا کسی سے میں

بانہوں سے میری وہ ابھی رخصت نہیں ہوا
پر گُم ہوں اِنتظار میں اس کے ابھی سے میں

دَم بھر تری ہوس سے نہیں ہے مجھے قرار
ہلکان ہو گیا ہوں تری دلکشی سے میں

اس طور سے ہوا تھا جُدا اپنی جان سے
جیسے بُھلا سکوں گا اُسے آج ہی سے میں

× اے طرحدارِ عشوہ طرازِ دیارِ ناز!
رخصت ہوا ہوں تیرے لیے دل گلی سے میں

تُو ہے، حریمِ جلوہ ہے، ہنگامِ رنگ ہے
جاناں بہت اُداس ہوں، اپنی کمی سے میں

کچھ تو حساب چاہیے آئینے سے تجھے
لوں گا ترا حساب مری جاں تجھ ہی سے میں

○

قافلے کا نہ انتظار کرو
خود ہی اب قصدِ شہریار کرو

ہے یہ شبخوں کا وقت اے یارو!
قصدِ ایوانِ شہریار کرو

نہیں صحرا میں آج کوئی غزال
گنگناؤ، غزل شکار کرو

شحنۂ وقت کی ہدایت ہے
مسلکِ جبر اختیار کرو

دیر و کعبہ کا بڑھ رہا ہے وقار
دیر و کعبہ کو بے وقار کرو

شیر افگن کی تعزیت کے لیے
تاجداروں پہ کوئی وار کرو

کسی شیریں کو انتقاماً آج
چل کر آزردۂ فشار کرو

کوہکن کے مزار پر چل کر
نصب اِک سنگِ یادگار کرو

○

ہم محبت میں خجل بھی رہے، نازاں بھی رہے
اُن کی حسرت بھی رہی، اُن سے گریزاں بھی رہے

عمر بھر ماتمِ حالات سے فرصت نہ ملی
عمر بھر مطربِ خلوت گہِ خوباں بھی رہے

پیشِ اغیار رکھی وضعِ تکبّر قائم
اور احباب کے شرمندۂ احساں بھی رہے

شہرِ ساقی میں رہا دلق فروشی پر مدار
اور اُسی شہر میں سر حلقۂ رنداں بھی رہے

ہم کہ انکار عقیدہ ہے ہمارا شیوہ
ہم ہی خود معتقدِ چشمِ غزالاں بھی رہے

ہر طرح ہم نے ترے دل کو دُکھایا اے شخص
ہر نفس اپنی شقاوت پہ پشیماں بھی رہے

مدتوں اُن کے تصور میں گزاریں راتیں
مدتوں اُن کی توجہ سے گریزاں بھی رہے

عرشۂ منبرِ واعظ کو بھی زینت بخشی
مسند آرائے شبستانِ نگاراں بھی رہے

ہے طرفہ قیامت جو ہم دیکھتے ہیں
ترے رُخ پہ آثارِ غم دیکھتے ہیں

غضب ہے نشیب و فرازِ زمانہ
نہ تم دیکھتے ہو، نہ ہم دیکھتے ہیں

تمنا ہے اب ہم کو بے حرمتی کی
سبھی کو یہاں محترم دیکھتے ہیں

چلو بے کمند و کماں آج چل کر
غزالوں کا اندازِ رَم دیکھتے ہیں

یہی تو محبت ہے یارو کہ اب وہ
ہماری طرف کم سے کم دیکھتے ہیں

خدایا ترے حُسنِ تقویم میں ہم
تضادِ وجود و عدم دیکھتے ہیں

نہ رُوٹھو جو لکھتے ہیں اوروں کو خط ہم
ذرا اپنا زورِ قلم دیکھتے ہیں

عجب کچھ ہے وہ سطرِ موئے بنفشی
جو روئے بیاضِ شکم دیکھتے ہیں

کھڑے ہو کہ ہم وقت کے حاشیے پر
فسادات دیر و حرم دیکھتے ہیں

بَلا کے وار ہوں یاران سر ہی جاتے ہیں
میاں یہ زخم ہیں آخر کو بھر ہی جاتے ہیں

ہے بات یہ کہ ترے التفاتِ بے جا سے
جو ہوش رکھتے ہیں وہ لوگ ڈر ہی جاتے ہیں

جہاں نہیں تمھیں جانے کی تاب اور تواں
تمام راستے جانی اُدھر ہی جاتے ہیں

جو لوگ کرتے ہیں جانے کی نوکری خود سے
وہ لوگ خود کو کہیں چھوڑ کر ہی جاتے ہیں

نہ کارواں، نہ جرس اور نہ راہ اور منزل
جہاں بھی جاتے ہیں، ہم بے سفر ہی جاتے ہیں

تو کیا عدم میں رہے ہو جو تم کو حیرت ہے
میاں وجود کے نشے اُتر ہی جاتے ہیں

مجھے یہ بات بہت ہی اُداس کرتی ہے
بگڑنے والے بچارے سُدھر ہی جاتے ہیں

ہیں خیمہ گاہِ شمالِ گماں کے ہم مطرب
جنوبِ شام میں ہم بے اثر ہی جاتے ہیں

ہم اس کو یاد دِلاتے ہیں اس کی بے تابی
یہ وار ہے تو چلو وار کر ہی جاتے ہیں

باہر گزار دی، کبھی اندر بھی آئیں گے
ہم سے یہ پوچھنا، کبھی ہم گھر بھی آئیں گے

خود آہنیں نہیں ہو تو پوشش ہو آہنی
یوں شیشہ ہی رہو گے تو پتھر بھی آئیں گے

یہ دشتِ بے طرف ہے گمانوں کا موج خیز
اس میں سراب کیا کہ سمندر بھی آئیں گے

آشفتگی کی فصل کا آغاز ہے ابھی
آشفتگاں پلٹ کے ابھی گھر بھی آئیں گے

دیکھیں تو چل کے یار، طلسماتِ سمتِ دل
مرنا بھی پڑ گیا تو چلو مر بھی آئیں گے

یہ شخص آج کچھ نہیں پر کل یہ دیکھیو
اس کی طرف قدم ہی نہیں، سر بھی آئیں گے

○

رنگ بادِ صبا میں بھرتا ہے
میرا اِک زخم شام کرتا ہے

سب یہی مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تُو
کیوں سُدھارے نہیں سُدھرتا ہے

شاہراہوں سے روز شام و سحر
ایک انبوہ کیوں گزرتا ہے

آئینے! تیرے سامنے وہ شخص
اب بھلا کیوں نہیں سنورتا ہے

ایلیا جونؔ کچھ نہیں کرتا
صرف خوشبو میں رنگ بھرتا ہے

○

ہوں میں یکسر رایگاں، افسوس میں
کیا کہوں میں بس میاں، افسوس میں

اب عبث کا کارواں ہے گرم سیر
میں ہوں میرِ کارواں، افسوس میں

کیسے پہنچوں آخر اپنے آپ تک
میں ہوں اپنے درمیاں، افسوس میں

آسمانِ لاجوردینِ ...... فراق
اب کہاں وہ اور کہاں افسوس میں

شعلۂ یاقوت فامِ زخمِ دل
میں ہوں کتنا تیرہ جاں، افسوس میں

یاد اُس لب کی عطش انگیز ہے
ہوں میں دوزخ درمیاں، افسوس میں

بازوانِ مرمرینِ ...... آرزو
وائے ہجرِ جاوداں، افسوس میں

سبزہ زارِ خوابِ لالہ فام میں
کس قدر ہوں میں تپاں، افسوس میں

پرتوِ سیمینِ مہتابِ گماں
گم ہوئی شمعِ گماں، افسوس میں

مجھ کو ہے درپیش اپنے سے فراق
میں کہاں اور میں کہاں، افسوس میں

دل میں نالہ توڑتا ہے جس کا فن
میں ہوں وہ آوازہ خواں، افسوس میں

میں ہوں گوشہ گیرِ گردِ صد ملال
اے غبارِ کارواں، افسوس میں

لحظہ لحظہ، لمحہ لمحہ، حال حال
میں ہوں از بگزشتگاں، افسوس میں

میرے ہی دل پر لگا ہے جس کا تیر
ہے وہ میری ہی کماں، افسوس میں

سُود ہے میرا زیاں، افسوس میں
جانِ جاں، جانانِ جاں، افسوس میں

رائیگانی میں نے سونپی ہے تجھے
اے مری عمرِ رواں، افسوس میں

اے جہانِ بے گمان و صد گماں
میں ہوں اوروں کا گماں، افسوس میں

نا بہ ہنگامی ہے میری زندگی
میں ہوں ہر دَم ناگہاں، افسوس میں

زندگی ہے داستاں افسوس کی
میں ہوں میرِ داستاں' افسوس میں

اپنے برزن' اپنے ہی بازار میں
اپنے حق میں ہوں گراں' افسوس میں

گُم ہوا اور بے نہایت گُم ہوا
مجھ میں ہے میرا سماں' افسوس میں

میرے سینے میں چراغِ زندگی
میری آنکھوں میں دھواں' افسوس میں

مجھ کو جُز پرواز کچھ چارہ نہیں
ہوں میں اپنا آشیاں' افسوس میں

ہے وہ مجھ میں بے اماں' افسوس وہ
ہوں میں اُس میں بے اماں' افسوس میں

خود تو میں ہوں یک نفس کا ماجرا
میرا غم ہے جاوداں' افسوس میں

وہ پیالہ ناف کا ہے نشہ خیز
اور میں از تشنگاں' افسوس میں

ایک ہی تو باغِ حسرت ہے مرا
ہوں میں اس کی ہی خزاں' افسوس میں

ہر نفر حمّالہ ہے یا بو لہب
یہ ہے میرا خانداں' افسوس میں

اے زمین و آسماں' افسوس تم
اے زمین و آسماں' افسوس میں

اے خداوندِ جہاں' افسوس تُو
اے خداوندِ جہاں' افسوس میں

قطعات

تم ہو جاناں شباب و حُسن کی آگ
آگ کی طرح اپنی آنچ میں گُم
پھر مرے بازوؤں پہ جُھک آئیں
لو مجھے اب جَلا ہی ڈالو تم

○

آپ کو تلخ نوائی کی ضرورت ہی نہیں
میں تو ہر وقت ہی مایوسِ کرم رہتا ہوں
آپ سے مجھ کو ہے اِک نسبتِ احساسِ لطیف
لوگ کہتے ہیں، مگر میں تو نہیں کہتا ہوں

○

چڑھ گیا سانس، جُھک گئیں نظریں
رنگ رُخسار میں سمٹ آیا
ذکر سُن کر مری محبت کا
اتنے بیٹھے تھے، کون شرمایا ؟

○

تم زمانے سے لڑ نہیں سکتیں
خیر یہ راز آج کھول دیا
دو اجازت ! کہ جا رہا ہوں میں
تم نے باتوں میں زہر گھول دیا

○

دُور نظروں سے خلوتِ دل میں
اس طرح آج اُن کی یاد آئی
ایک بستی کے پار شام کا وقت
جیسے بجتی ہو کوئی شہنائی

○

شرابی بھُول جاتے ہیں سبھی کچھ
پھر اس پر خود سے اِک بیگانگی بھی
تو کیا تم تھیں مرا سرمایۂ جاں؟
تو کیا میں نے تمھیں پر جان دی تھی؟

○

ہیں بے طور یہ لوگ تمام
اُن کے سانچے میں نہ ڈھلو
میں بھی یہاں سے بھاگ چلوں
تم بھی یہاں سے بھاگ چلو